U0053

[illegible]

رہنمائے قرآن

تصنیف

الحاج نواب سر نظامت جنگ بہادر

ترجمہ

ڈاکٹر میر ولی الدین، منشی فاضل

ایم اے۔ پی ایچ ڈی (لندن) بیرسٹرایٹ لا

رہنمائے قرآن

تصنیف

الحاج نواب نظامت جنگ بہادر

ترجمہ

ڈاکٹر میر ولی الدین، منشی فاضل، ایم اے، پی ایچ ڈی (لندن)، بیرسٹرایٹ لا
اُستاذِ فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

باہتمام مکتبہ برہان، دہلی قرول باغ

مطبوعہ جید برقی پریس دہلی

فہرست عنوانات

عرض مترجم

میرے بزرگ نواب سر نظامت جنگ بہادر نے مجھ سے خواہش کی کہ میں اُن کی انگریزی کتاب An Approach to Study of the Quran کا اُردو زبان میں ترجمہ کردوں۔ کیونکہ انھیں اپنی دوسری اہم مصروفیتوں کی وجہ سے اس طرف توجہ کرنے کی فرصت نہ تھی میں نے اُنکی اس خواہش کی تعمیل کو اپنا ایک مقدس فریضہ خیال کیا اور نہایت تعشق و انہماک سے اُس کی تکمیل کی۔ نواب صاحب محترم کی انگریزی زبان میں جو شعریت ہے، جو سطوت و جلالت ہے اُس کو اُردو زبان میں کس طرح ادا کیا جا سکتا تھا تاہم پوری کوشش کی گئی ہے کہ ترجمہ بھی مصنف کی زبان کا پورا آئینہ دار ہو۔ انگریزی کتاب کی بعض عبارتیں نواب صاحب کے مشورے سے ترک کردی گئی ہیں اور خود انگریزی کتاب کی طبع ثانی میں بھی انکو حذف کردیا جائے گا

اصل کتاب کی نسبت یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس کا خطاب زیادہ تر غیر مُسلم افراد سے ہے اور خصوصاً انگریزوں سے جن کی نفسیات سے مصنف خوب واقف ہیں، وہ ان کی مشکلات کو جانتے ہیں، وہ اُنھیں خدا کا کلام سناتے ہیں، اسلام کے حقائق و دلائل سے واقف کرتے ہیں، رشد و ہدایت کو غی و ضلال سے میز کرکے بتاتے ہیں اور پھر قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ کہہ کر علیحدہ ہوجاتے ہیں کیونکہ دین میں اس کے بعد کوئی اِکراہ نہیں۔ یہ طریقہ حکیمانہ ہے، فلسفیانہ ہے اور اس کی اپیل دل و دماغ دونوں کے لئے یکساں موثر ہے اور پھر جس سادگی اور کمالِ لطافت کے ساتھ اس کو پیش کیا گیا ہے وہ اس کے اثر کو بیحد قوی اور نامدفوع بنا دیتا ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو بات حق ہے اور ایک قلبِ سلیم سے نکلی ہے ؎

بصدق ہر چہ برآوردم ز دل صائب چو صبح مشرق خورشید شد گریبانش

میر ولی الدین
جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن
جنوری ۱۹۴۲ء

۷۸۶

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست ؟
زیر گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست ؟

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ او لایزال است و قدیم

نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات
بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

حرف او را ریب نے تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

نوعِ انساں را پیامِ آخریں
حاملِ او رحمۃ للعالمیں

(اقبال)

باب اوّل

کتاب و صاحبِ کتاب

ادھر آخر عمر میں قرآن کے مطالعہ سے مجھ کو اس بات کا کامل یقین ہو گیا ہے کہ یہ جس پیام کا حامل ہے اُس کے قلب تک پہنچنے کے لئے ایک صاف سیدھی قابلِ فہم راہ کا معلوم کرنا نہایت ضروری ہے۔ یہ راہ پڑھنے والوں کے لئے بہ نسبت اس راہ کے زیادہ آسان و ہموار ہونی چاہئے جو مسلکِ قدیم کے فاضل مفسرین نے اختیار کی تھی۔ کیونکہ ان کے ساتھ کسی سوءِ ادب کے شائبہ کے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جن حضرات نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اُنھیں قرآن کے معانی کا عمیق علم حاصل ہے وہ اپنے دائرہ سے باہر نکل گئے! ان میں سے بعض تو مابعد الطبیعاتی مباحث کے آسمان پر پرواز کرنے لگے اور اپنے تلامذہ کو زمین ہی پر حیران و سرگردان چھوڑا۔ ہمیں یہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ قرآن انسان کی ہدایت کے لئے نازل ہوا ہے، اس کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک روشن ہدایت ہے، اور اُس کی یہ ہدایت دراصل روحانی و اخلاقی نوعیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کردارِ انسانی کے تزکیہ کے لئے حکمتِ عملی کا ایک گنجینہ قرار دیا جاتا ہے۔

اگر ہم اس تعین کے ساتھ قرآن کا مطالعہ کریں تو ہماری رفتارِ ترقی زیادہ آسان، ہمارا اکتسابِ علم زیادہ فائدہ بخش اور ہمارے قلوب پر اس کا اثر زیادہ قوی ہو گا۔ ان صفحات میں میری

غایت اسی طریقۂ عمل کو پیش کرنی ہو گی۔ وباللہ التوفیق۔

کتاب | قرآن مجید کے مطالعہ کا جو طریقہ میں نے اختیار کیا وہ علماء کا پسندیدہ نہ تھا؛ نہ میری یہ خواہش تھی کہ پیامِ قرآنی کے "بطن" کا فہم حاصل کروں۔ میری نظر میں جو سوال ہمیشہ رہا وہ یہ تھا کہ اس واقعہ کی کس طرح توجیہہ کی جائے کہ اسی کتابِ مقدس نے ایک مردِ باخدا کے ہاتھوں بنی نوعِ انسان کی قسمتوں کے ڈھالنے میں اس قدر عظیم الشان حصہ لیا، اور اس معجزہ کی نوعیت کا تعین کیا جائے جس کی وجہ سے اس نے دشتِ عرب کے وحشیوں کو سکھلا دیا کہ چند ہی سال کے عرصہ میں وہ تاریخ عالم میں ایک زبردست اور متقی قوم کی حیثیت سے اپنی جگہ بنا لے، اور اس قوم ساز قوت کا راز دریافت کر لیا جائے۔

اسلامی تعلیم کا مرکز | گزشتہ بیس سال سے میں قرآن کا خاص اہتمام سے مطالعہ کر رہا ہوں اور اگر مجھ سے یہ پوچھا جائے کہ اس کی تعلیمات کے متعلق میرا کیا خیال ہے تو میں کہوں گا "زندگی کے تمام اعمال میں ایمان اور عمل صالح پر اصرار"۔ قرآن انسان کو اس کے خالق کا واسطہ دے کر اس امر پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ اپنی خواہشات و اعمال کا بیدار چشم دربان بن جائے اور اپنے کو تزکیۂ روح میں مصروفِ جہاد رکھے۔ کیونکہ اس کی ہر جنبش اس کی روح پر اثر انداز ہوتی ہے۔ خیر سے خیر اور شر سے شر پیدا ہوتا ہے اور خیر و شر اپنی جزا آپ ہیں۔ اسی قاعدے کو (جس کی قرآن میں بار بار تکرار کی گئی ہے) اسلام کا مرکز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کی تائید اس اصول سے بھی کی گئی ہے کہ کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا: "اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی" (پ۲۷)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی روح اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتی اور اسلام میں کفارہ یا "تحمل الآثام بیدل الغیر"[1] کے نظریہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے

---

[1] دوسروں کے گناہوں کا بوجھ اٹھانا

بدمکینی و نیک طمع میداری ہم بد باشد سزائے بدکرداری
باآنکہ خداوند کریم است و رحیم گندم ندہد بار چو جو می کاری (رومی)

قرآن مجید کی تلاوت کے وقت میں محسوس کرتا ہوں کہ حیاتِ انسانی و علائقِ انسانی منظرِ شہود پر ہیں۔ ایک چھوٹے سے قریہ کے باشندوں کے کرتوت نے (جس کا نام مکہ تھا) صواب و خطا، صدق و کذب، توحید و شرک، بقا و دوام، فنا و زوال، جیسے عظیم الشان سوال کھڑے کر دیئے ہیں۔ آپس کے جھگڑوں اور اُن سے پیدا ہونے والے پست واقعات نے ایک بلند مرتبہ ذہن کو اس امر کا واضح اِدراک بخشا کہ کونسی چیز اختیار کی جائے اور کونسی رد۔ اور اسی اِدراک نے اُس کو رفتہ رفتہ کُلّی صداقتوں کے پہچاننے اور عملِ صالح کو فوراً ایمانِ راسخ کی قوت کے ساتھ قبول کرنے پر آمادہ کر دیا۔ روزمرہ کی زندگی کے انھیں سبقوں سے ایک اخلاقی ضابطہ مدون ہوا جس کو وحی الٰہی نے مذہب کی مقدس شکل بخشی۔

صاحب کتاب | میں کعبۃ اللہ کے سامنے بیٹھا یہ لکھ رہا ہوں اور اس ٹھوس مربع عمارت کو، جس کے اطراف ہزاروں مرد عورت طواف کر رہے ہیں، اس عظیم الشان کش مکش کا مرکز پا رہا ہوں جو آج سے ۱۳۷۰ برس پہلے حق و باطل کے درمیان پیدا ہوا تھا۔ اس وقت اُس میں بُت رکھے تھے، جن کے مختلف نام تھے، جن کو مختلف قوتوں سے متصف کیا جاتا تھا اور جن کی عبادت کی جاتی تھی۔ ان کی الٰہی صفات و قُویٰ کو ہر ایک تسلیم کرتا تھا اور نہ کرتا تھا تو ایک جوانمرد جس کی فہم سلیم نے اس کو یہ تبلایا تھا کہ پتھر عبادت و احترام کے قابل نہیں! اس کے باطن کی آواز نے اُس کو یہ یقین دلایا تھا کہ جس قوت نے فطرت کو، اور اُس کے ان گونا گونیوں کو پیدا کیا ہے، درحقیقت واحد، ناقابلِ تقسیم، قادرِ مطلق قوت ہے جو ہمہ داں و ہمہ بیں و ہمہ تواں ہے۔ اس نے اپنی جوانی کا زیادہ حصہ فطرت کے نظارہ میں صرف کیا تھا، زمین و آسمان، پہاڑوں اور میدانوں کے نظارہ

میں! ان ہی پہاڑوں اور میدانوں میں! دلوں نے روئیدگی پیدا کی تھی جس کی وجہ سے انسان اور چرند و پرند کی زندگی کا قیام ممکن تھا۔ فطرت کا یہ متحرکِ ذہن نظارہ اُس کے دماغ کو خیالات سے بھر رہا تھا اور اُس پر ایک حیرتِ محمودہ طاری تھی، اور اُس کی روح کی گہرائیوں سے یہ اُٹھی سوال اُٹھ رہا تھا کہ "ان تمام کا صانع اور حاکم کون؟" کعبہ کے یہ بُت تو ہرگز نہیں! وہ یوں ہی محوِ فکر رہا یہاں تک کہ فطرت کے اس پیدائشی نظارہ بازکی توجہ زندگی کے اُس ادا کار کی طرف مبذول ہوئی جس کو انسان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انسان کی تخلیق کیسے ہوئی؟ کیا وہ اپنا خالق آپ ہے؟ اس کو یہ برتری کس نے عطا کی؟ کیا انسان ہی کے ہاتھوں نے ان بتوں کو نہیں گھڑا جن کے سامنے اس نے بیوقوفی سے اپنا سرِ عبودیت خم کر دیا ہے؟ یہ بُت بھی کیسے عاجز اور کیسے قابلِ نفرت ہیں! ان کو اس حیرت انگیز کائنات کا صانع قرار دینا کتنی حماقت ہے، کتنا دیوانہ پن ہے!

زندگی کے بنیادی مسائل میں گھر کر شب و روز اسی بدیہی کذب پر غور کرتے ہوئے اِس باخدا کا ذہن کانپ اُٹھا اور وہ کئی کئی دن بحرِ فکر میں غرق رہا۔ اور اکثر تنہائی کی تلاش میں، جو الہامِ ربّانی کا ایک ذریعہ ہے، اس نے اپنے دن خموش پہاڑوں کے غار میں گزارے۔ یہ تھے وہ ابتدائی حالات جن میں ہونے والے پیغمبر کو اپنے پیغام کے لئے تیار کیا جا رہا تھا۔ اس کو اہالیانِ مکہ کی زندگی کے غیر حقیقی ہونے کا احساس ستا رہا تھا جو اپنے باطل عقائد اور شنیع اعمال میں سرگرداں تھے، اور اُس کے ذہن پر ہر لحظہ اور ہر گھڑی اس عظیم الشان عالم موجودات کے حقیقی ہونے کا خیال مسلط تھا جس پر قوانین الٰہی کی حکمرانی ہے اور جس کی کھلی نشانیوں کا وہ زمین و آسمان میں، ہر طرف مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس کے اذعانات میں گہرائی اور قوت پیدا ہوتی چلی جا رہی تھی لیکن وہ ان کا اظہار نہ کر سکتا تھا، بلکہ کسی ایک متنفس سے بھی ان کا ذکر نہیں کر سکتا تھا۔ ایک سمندر اس کے قلب کے اندر موجزن تھا لیکن اس کا دہانہ بند تھا! اس کی روح میں تلاطم تھا! بالآخر اس کی زندگی کا ن

برترین لمحہ میں آ پہونچا جب اُس نے محسوس کیا کہ وہ ایک عظیم الشان طاقت کے ہاتھ میں محض ایک آلہ کی حیثیت رکھتا ہے جو اُس کو ایک ناقابلِ مدافعت قوت کے ساتھ مجبور کر رہی ہے کہ اُس کی موت و حیات، تباہی و نجات کے پیام کو بنی نوعِ انسان کے سامنے پیش کر دے!

اوّل مرتبہ یہ حکم اس کو کس طرح پہونچایا گیا اور کس خوف و ہراس کے ساتھ اس نے اپنے آپ کو اس امر پر آمادہ کیا کہ سب سے پہلے اپنی چہیتی بیوی اور پھر بعض اقرباء سے اس کا ذکر کرے، جو بہت جلد دائرۂ ایمان میں داخل ہوگئے؛ اور سب سے آخر میں کس طرح اُس نے اہلِ مکہ کے سامنے اپنا پیغام پیش کیا اور بطور نتیجہ ان کی ملامت و سرزنش و استہزاء کا نشانہ بنا۔ یہ سب واقعات اس قدر مشہور ہیں کہ اُن کا اعادہ ضروری نہیں۔ اور نہ ہم اُن مظالم کی دل شگاف داستان ہی کی تفصیل میں جائیں گے جو مسلسل تیرہ سال تک اُس پر ڈھائے گئے، جنھوں نے اُس کو قانون کی نگاہ میں باغی بنا چھوڑا اور جس کی زندگی کے تلف کر دیئے جانے پر کوئی خون بہا نہ تھا۔

کہا جاتا ہے کہ اہلِ مکہ جنھوں نے پیغمبر کی زندگی کو ناممکن بنا دیا تھا، اس امر کی بھی کوشش کرتے رہے کہ آنحضرت کو اس لالچ میں مبتلا کریں کہ وہ اُن کی شادی مکہ کی سب سے زیادہ حسین عورت سے کر دینگے، اور اُنھیں اپنا بادشاہ تسلیم کر لیں گے۔ کیا وہ اس پیشکش کو قبول کر لیں یا اپنی والہانہ سعی میں قائم رہیں اور اسی میں مرمٹیں؛ ان کا جواب اور اس کے نتائج تاریخ میں محفوظ ہیں۔

ہمارے سامنے ایک ایسا انسان ہے جو خوف کا نام بھی نہ جانتا تھا کیونکہ وہ سراپا صداقت تھا۔ جو یاس و ریب سے ناواقف تھا، جس کے صبر کا پیمانہ باوجود سخت ترین مصائب اور جور و تعدی کے نہ چھلکا۔ اور نہ ہی اس کا شعلۂ غضب بھڑکا، اور نہ ہی کسی قسم کی رشوت اس کو اپنی جگہ سے جنبش دے سکی! اس کی اس یکسوئی، اِس خلوصِ عظیم، اس شدید یقین و اعتماد کا راز کیا تھا؟ اس کے پیغام کی صداقت! حق تعالیٰ نے خلق کی رُشد و ہدایت کا اسکو براہ راست

حکم دیا تھا اور یہ حکم واجب التعمیل تھا! اس نے محسوس کیا کہ اس کی حیثیت محض ایک ظرف کی سی ہے جس میں صوتِ سرمدی اپنی بے پایاں قوت کے ساتھ داخل ہو رہی ہے۔ اور اس کا اپنا فریضہ صرف یہی ہے کہ وہ اس کو دوسروں تک پہونچا دے۔ وحی الٰہی بالکل ناقابلِ مدافعت تھی، وہ اسکو نظر انداز نہ کر سکتا تھا۔ وہ وحی الٰہی کا استعمال نہیں کر رہا تھا بلکہ وحی الٰہی اس کا استعمال کر رہی تھی۔ ان آلات کی طرح جو خارج سے آوازوں کو وصول کرتے اور پھر ظاہر کر دیتے ہیں، اسکی کیفیت بھی انفعالی تھی، چنانچہ پیغامِ الٰہی کے حصول کے وقت اس پر جو حالت طاری ہوتی تھی اُس کی مثال صرع کے دورے سے دی گئی ہے! یہ ہے نوعیت اس کی رسالت کے اہم واقعات کی! ولا مشاجرۃ فیھا! ان سے کیا بات ثابت ہوتی ہے؟ یہ کہ وہ مفتری نہ تھا، کتابوں کا گھڑنے والا نہ تھا، وعظ گو نہ تھا۔ وہ ایک امی تھا، عام معنی میں ناخواندہ، اس نے جھوٹ کبھی نہ کہا تھا۔ اس کی قوم اسی حیثیت سے اس کو جانتی تھی، اور اسی حیثیت سے وہ سارے جہاں کے سامنے ہے: ایک نجات بخش پیغام کا حامل، ایک با اقتدار طاقت کی زبان۔ وحی الٰہی کا آلہ! لیکن یہ اس کی صرف ایک حیثیت ہے، دوسری حیثیت سے وہ معلمِ اخلاق و مُنذِر ہے۔ پھر وہ مصلح، رہبر، مدبر اور قوم ساز بنتا ہے! اور بالتبع مقنن، قائدِ افواج اور بادشاہ (واقعۃً گو اسمًا نہیں) اور ان سب کے اطراف قمرِ نبوت کا ہالہ۔ قانونِ الٰہی کا نشان باصرہ نوازی کرتا ہے! اس کو ایسے رویائے صادقہ دکھلائے جاتے ہیں جن کو معمولی انسان نہیں دیکھ سکتا، اور اُن ہونے والے واقعات کے متعلق پیشین گوئیاں ہوتی ہیں جو انسانی ادراک و بصیرت سے بالکل ماورا ہوتے ہیں۔ ایسے ملکات اور ایسی قوتوں کے باوجود اس کا زندگی میں حقیقی کام کیا تھا؟ شریف مقاصد کے حصول کے لئے اخلاقی ہدایت! قرآن کریم کا یہی حقیقی پیغام ہے جس کا وہ مسلّمہ مُفسّر ہے۔

میں نے ابتدا میں یہ کہا ہے کہ قرآنی تعلیم کی روح فلاح و تقویٰ ہے اور اب میں اسکی

زندگی کے اُس دور تک پہونچا ہوں جب وہ تقویٰ کے ایک عظیم الشان اُستاد کی شان میں جلوہ گر ہوتا ہے اور بتلاتا ہے کہ کس طرح تھوڑے ہی سے عرصہ میں ایک بے رحم دبدکار جماعت کے لوگ جو نہ باطناً کسی ضمیر کے حامل تھے اور نہ خارجاً کسی حکمراں قوت کے قائل، مسخر کرلئے جاتے ہیں اور ان کی کامل اصلاح ہوجاتی ہے، چنانچہ ان ہی میں سے وہ باخدا پیدا ہوتے ہیں جو تمام عمر اسکی صحبت میں رہنے کے قابل ہوتے ہیں، جو فوجوں کی قیادت کرسکتے ہیں اور مفتوحہ ممالک کا انتظام لیکن اپنی خانگی زندگی میں سخت بے غرضی و بےنفسی سے کام لیتے ہیں۔ خلیفۂ اوّل نے اپنی ساری دولت اسلام کے قدموں پر نثار کردی تھی اور برسرِ خلافت ہونے کے باوجود ایک غریب آدمی کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ جب اُنھوں نے فوجیں روانہ کیں تو سپہ سالاروں کو ان کے احکام یہ تھے:۔

"یاد رکھو کہ تم ہر آن حق تعالیٰ کے حضور میں ہو، موت تم سے قریب ہے، قیامت برحق ہے، جنت کی اُمید دلائی گئی ہے۔ ظلم و تعدی سے بچو، اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرتے رہو، اپنے فوجیوں کی محبت و اعتماد کو برقرار رکھنے کی کوشش کرو۔ جب حق تعالیٰ کی راہ میں لڑو تو مردانہ وار لڑو، پیٹھ نہ پھیرو۔ لیکن اپنی کامیابی کو عورتوں اور بچوں کے خون سے داغدار نہ کرنا! کھجور کے درختوں کو تباہ نہ کرو اور نہ کھیتوں کو جلاؤ۔ میوہ دار درختوں کو نہ کاٹنا اور نہ مویشیوں کو قتل کرنا، ہاں اپنی غذا کیلئے تم ان کو مار سکتے ہو۔ جب تم کوئی معاہدہ کرو تو اُس کو پورا کرنا اور قول کے ہمیشہ سچے رہنا۔"

قرآن کی تعلیم اور اس اولوالعزم پیغمبر کے اسوۂ حسنہ کے سوا کون سی شے ایسی شخصیت پیدا کرسکتی تھی؟ پھر فاروقِ اعظم کی شخصیت پر غور کرو جو پیوند لگے کپڑے پہنے مسجد نبوی میں فرشِ زمین پر بیٹھ کر ایران، شام اور مصر کے فرمانرواؤں کے ہاں حکم نامے روانہ فرماتے تھے کہ اپنے ملک پر

صالحین کی طرح حکومت کریں، خدا ترس اور سادہ انسان کی طرح زندگی بسر کریں، تمام دادخواہوں کو خود سے ملنے کی عام اجازت دیں۔ اپنے دروازوں پر پہرہ نہ مقرر کریں، ریشمی لباس نہ پہنیں وغیرہ، سوائے قرآن کی تعلیم اور اس اولوالعزم پیغمبر کے اسوۂ حسنہ کے کون سی شے ایسے سپہ سالار اور فوجی پیدا کر سکتی تھی جنھوں نے ایران کے مالِ غنیمت اور مدینؔ کے ناقابلِ یقین خزانوں کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا؟ کیا تاریخ کوئی ایسی دوسری مثال پیش کر سکتی ہے جہاں ایک شخص کے ذاتی اثر سے ایسی اخلاقی اصلاح ہوئی ہو۔ یا ایسے نظامِ حیات کی نشان دہی کر سکتی ہے جس نے خود بخود پھیل کر ایک عظیم الشان تہذیب کی شکل اختیار کر لی ہو اور جو اپنے بقا و استمرار میں اس قدر پائدار رہا ہو؟ کیا یہ بات نہیں کہ اس کی بے مثل شخصیت اور بے مثل کارناموں کی وجہ سے سارا یورپ اسکی کامیابی پر محوِ حیرت ہے اور بعض اہلِ یورپ باطل ترقی اور قریب الوقوع مصائب والی اس بیسویں صدی میں یہ خواہش کر رہے ہیں کہ کاش محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسا آمر اب پیدا ہوتا! ہم جانتے ہیں کہ کارل اُرل جیسا عمیق النظر مفکر، جو دل کا سچا اور تمام ڈھونگوں اور حیلوں کا جانی دشمن تھا، ان کے متعلق کیا کہتا ہے۔ ہمیں علم ہے ڈاکٹر جانسن جیسے مخلص اور خدا ترس شخص نے پیغمبر کی اس دل سوز آواز کے متعلق کیا لکھا ہے جو اب تک بیابانوں، شہروں اور محلوں میں گونج رہی ہے اور خلق اللہ کو نور کی جانب ہدایت کر رہی ہے۔

قرآن: صحیفۂ فطرت اب مجھے تم سے یہ کہنا ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ، جو پیغمبر کے قلب پر القا ہوئے تھے، اُن کی روح کو، اُن کی زندگی کو اور اُن کے سارے کام کو ہم پر منکشف کرتے ہیں۔ ان سے اس موقع و محل کا بھی انکشاف ہوتا ہے جہاں اُنھیں کام کرنا تھا ـــــ وہ شدید تنازع، وہ تلخ مخالفت، اور آخری کامیابی کا وثوق و یقین! یہ تمام چیزیں قرآن کو ایک انسانی کتاب بنا دیتی ہیں (جیسا کہ ایک انگریز خاتون نے مجھ سے کہا تھا) اور اس کے سارے صفحات میں، ایک ایسا قوی فہم سلیم

اور اس کے سادہ براہین میں ایک ایسی یقین آفریں معقولیت پائی جاتی ہے کہ اس کو بجا طور پر (جیسا کہ میرے ایک اور انگریز دوست نے کہا تھا) ایک عقلی کتاب کہا جا سکتا ہے۔

وہ ایک سادہ اوامر و نواہی کی کتاب ہے، وہ قلوب کو فوراً متاثر کرتی ہے، اپنے بیانات میں معقول ہے، اس میں فاسقین کے لئے عذاب کی وعید اور صالحین کے لئے جزا و ثواب کی بشارت ہے۔ وہ صفاتِ حسنہ و سیئہ کی ایک کامل فہرست پیش کرتی ہے۔ اس کی زبان سادہ ہے لیکن موقع موقع پر اس میں گرج بھی پیدا ہو جاتی ہے اور موسیقی بھی۔ وہ ایک ایسی کتاب ہے جسکو مردہ دل بھی آسانی سے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ عمل صالح کے لئے، جو تقوی کی زندگی کی پہلی شرط ہے، بانگ دہل کا کام کرتی ہے اور ہماری خوش قسمتی سے اس میں نہ کوئی غیر معقول ما بعد الطبعیات ہے اور نہ کوئی ناقابل فہم سر یا غموض۔

یہ کہنے سے میرا مطلب یہ نہیں کہ میں قرآن کو ایک نصابی کتاب قرار دیتا ہوں جس کی ترتیب باضابطہ ہے، جو اپنے موضوعات کو منطقی لحاظ سے علیحدہ علیحدہ فصول میں تقسیم کرتی ہے۔ ایسا نہیں ہے اس کے برخلاف کہا جا سکتا ہے، اور یورپی مصنفین نے کہا بھی ہے، کہ قرآن میں ایک بے ترتیبی سی ہے۔ اور یہی میرے نزدیک اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ اس کو کسی ایک شخص نے اپنے اختیار سے نہیں لکھا؛ وہ مجموعہ ہے ان آزاد پیاموں کا جو کسی قوی جبروتی دباؤ کے تحت زبان سے نکلے ہیں، جن میں سے بعض تو تعجب، تنبیہہ، نصیحت اور وعدے پر مشتمل ہیں، اور بعض ان اقوام کی قسمت پر غور و فکر کرتے ہیں جنھوں نے انبیاء کی تکذیب کی، جو اُن کی ہدایت و نجات کے لئے بھیجے گئے تھے، اور تمرد و عصیاں میں اپنی جان دی۔ مختلف سورتوں میں وہ حضرت موسیٰؑ و حضرت عیسیٰؑ اور دوسرے انبیاء کی رسالت کا مختصر تذکرہ کرتی ہے۔ اس کتابِ مقدس کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہر جگہ نیک کردار اور صائب اعمال کے متعلق ہدایات درج ہیں اور ازدواجی تعلقات اور توریث

کے مخصوص قوانین ملتے ہیں۔ چھوٹی سورتیں جو مکہ میں اُتری ہیں اپنے طرزِ بیان میں عام طور پر، بے ربط، جذباتی اور خطابیاتی ہیں۔ فطرت کی بعض نشانیوں کی طرف اشارہ کرکے، جو خدا کی عظمت و قوت و حکمت پر دلالت کرتی ہیں، جن کو دیکھ کر بھی انسان اپنی ناشکری نہیں چھوڑتا، ذہن میں گویا نقوش بٹھائے جارہے ہیں۔ مشاہدۂ فطرت، اس سے پیدا ہونے والے قوی احساسات، لازوال صداقتوں کے فوری ادراکات، یہ سب ایک پُر اسرار طریقہ سے مخلوط ہیں اور اُنھوں نے متکلم کو ایک اثر پذیر خوش لحن آلہ بنادیا ہے۔

"پیغمبر کی پکار" اسی سے قرآن کے طرزِ بیان اور اُس کی ظاہرا بے ترتیبی کی توجیہہ ہوتی ہے جو ان لوگوں کے لئے نہایت پریشان کن ہے جو پیغمبر کے ذہن کے باطنی احوال، اس کے اضطرار اور اس قاہر اثر کو نہیں سمجھ سکتے جو اس پر عمل کررہا تھا۔ "یہ پیغمبر کی پکار" کی نوعیت کی توجیہہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر جانسن کا یہ نفیس جملہ ایک شعاعِ نور کے مانند ہے جو ظلمتوں کو دور کرتا اور اُس بکواس کا خاتمہ کردیتا ہے جو قرآن کی بے ترتیبی کے متعلق کی جاتی ہے۔ جس طرح کہ فطرت کی کثرت میں ایک وحدت ہے، ایک قوت ہے جو ہر شے میں جاری وساری ہے اور ہر شے کو حیات بخش رہی ہے، اسی طرح قرآن کے بظاہر بے ترتیب مواد میں موضوع، خیال اور احساس کی ایک وحدت پائی جاتی ہے۔ جو لوگ مرتّب کتابوں کے پڑھنے کے عادی ہیں اور انبیاء کی آواز سے مانوس نہیں وہ فطری طور پر پہلے پہلے قرآن پڑھنے سے گریز کریں گے۔ لیکن انھیں اس کو بار بار پڑھنا چاہئے یہاں تک کہ اثرات اپنا کام شروع کردیں، اور الفاظ اور اُن سے منکشف ہونے والے نظّارے ان کو اِدراک کی اس دنیا سے ماوراء لے جائیں، وہاں لے جائیں جہاں حقیقت کا فہم وجدان سے حاصل ہوتا ہے! اب نقوش اُجاگر ہوں گے، ان میں وسعت پیدا ہوگی، یہاں تک کہ وہ زمین و آسمان پر چھا جائیں گے اور آواز میں وہ گرج اور موسیقی پیدا ہوجائے گی جو کسی دوسری کتاب کی زبان میں نہیں ملتی!

قرآن کے مطالعہ کے وقت پڑھنے والے کو یہ پہلو اختیار نہیں کرنا چاہئے کہ گویا اسکی حیثیت ایک نقاد کی سی ہے جو کسی ادبی رسالہ کے لئے اس پر ایک مضمون لکھ رہا ہے یا کسی مجلہ میں مختصر طور پر تبصرہ کرنا چاہتا ہے۔ اور نہ ہی اس کا پہلو اس علامۂ دہر کا سا ہونا چاہئے جس کا ذہن خود اپنے ہی علم کے بوجھ سے دباجا رہا ہے اور جو کسی ایک خاص نظام کی طرف مائل ہے اور دوسرے نظامات سے بدظنی رکھتا ہے۔ تمام مقدس کتابیں اپنے اندر ایک انجذابی قوت رکھتی ہیں لیکن یہ غیر مرتد و قلوب ہی کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ تمھیں چاہئے کہ تم ان کا مطالعہ کھلے ذہن اور صاف دل سے کرو، پھر یقینی کوئی نہ کوئی عمدہ چیز تمھیں ان میں ملے گی، کم از کم ان کی اچھائی کی روح ہی سے تم کو فیض پہونچے گا۔ لیکن قرآن کے متعلق تو میرا دعویٰ اس سے کچھ اور زیادہ ہے: اس میں ایک غیر معمولی وسعتِ نگاہ ہے، فطری صداقت ہے، اصلاح و تقویٰ پر اصرار ہے اور یہ انسان کو فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ خیر کو شر سے، خطا کو صواب سے جدا کرنے پر مُصر ہوتا ہے۔ یہ مذہب کو آسمان سے زمین پر اتار لے آتا ہے اور اس کو ایک ایسی قوت کی حیثیت سے پیش کرتا ہے کہ جس کے سامنے دُنیا کی گردنیں جھک جاتی ہیں (جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ یہی کام سقراط نے فلسفہ کے ساتھ کیا تھا) قرآن فطرت کو مصنوعی حدود میں محدود نہیں کردیتا۔ وہ نجات کے لئے کسی قسم کی رسوم کو ضروری قرار نہیں دیتا۔ جس نماز کے روزانہ پڑھنے کا وہ حکم دیتا ہے وہ محض ایک رسم نہیں بلکہ خالق کے روبرو عبودیت و استعانت کا اظہار ہے، اور اُس کی اصل روح ہدایت کے لئے دُعا ہے۔ وہ تمام بنی نوعِ انسان کو آپس میں بھائی بھائی قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ سب ایک ہی دین سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ دین دینِ فطرت ہے جس کی روسے انسان برضا و رغبت ان قوانین کے آگے سرِ تسلیم خم کردیتا ہے جنھیں خدا نے بنایا ہے۔ کیا قانونِ فطرت تمام مخلوقات پر حاوی نہیں؟ یہ قرآن کی تعلیم کی ہمہ گیری، اس کی پیمبرانہ بصیرتوں کی صداقت، اس کی سادہ زبان کی حرارت و وضاحت ہی کی وجہ ہے

جو اس میں ایک حیرت انگیز قوت پائی جاتی ہے۔ جو قلب کو گرما دیتی ہے اور آنکھوں میں آنسو بھر لاتی ہے اس کی آواز حقیقت میں ایک گونجنے والی "پیغمبر کی پکار" ہے۔ اگر تم اپنے دماغ سے اس خیال کو دور کر دو کہ قرآن مواعظ کی ایک درسی کتاب ہے جو منبر کے استعمال کے لئے لکھی گئی ہے تو تمہیں اسکے متعلق بہت سے فاسد خیالات سے نجات مل جائے گی۔ اور اگر تم اس مشتبہ عقیدہ کو بھی ترک کر دو کہ یہ ایک پُراسرار آسمانی زبان ہے جو فہم انسانی سے ماوراء ہے تو تم اس کو ایک انسانی کتاب پاؤ گے جو اس زندگی میں انسانی ہدایت کے لئے بھیجی گئی ہے، اور اسی زندگی سے گزرتے ہوئے دوزخ یا جنت کی طرف راستہ جاتا ہے!

میں مکرر عرض کرتا ہوں کہ قرآن کی آواز، اپنی تمام موسیقی اور گرج کے ساتھ، عمل صالح کو بیدار کرنے کے لئے بانگ دہل کا کام دیتی ہے۔ یہ ایک ہمت افزا، قوت بخش اور یقین آفریں آواز ہے۔ اس میں کہیں نہ شک وشبہ کا اثر ہے اور نہ نظری حیرانی کا نام ونشان۔

یہ انسان کو آمادہ کرتی ہے کہ وہ اپنے کو کامل انسانیت کے اعلیٰ ترین معیار تک پہونچائے تاکہ اس کی روح صفاتِ الہٰی کی تکمیل کر سکے۔ وہ یہ اعلان کرتی ہے کہ تقویٰ سے انسان کامل ہوتا ہے۔ محنت ومشقت، پیکار وکش مکش کی اسی دنیا میں وہ اس کی جنت کی بنا قائم کرتی ہے۔ وہ اس کو دنیا کا مقابلہ کرنے، اس میں رہ کر مصروفِ عمل ہونے اور فطرت کے واقعات کو ایک عظیم الشان نظام کا جزو سمجھ کر قبول کرنے کی ہمت بخشتی ہے۔ انسان کا کام ان سے گریز کرنا نہیں، نہ ہی شر کے آگے بزدلی سے سر جھکا دینا ہے بلکہ ان کا مقابلہ کرکے ان پر غالب آنا اور اپنی ذات کو انکے مضر اثرات سے محفوظ رکھنا ہے۔ یہی صراط مستقیم ہے۔

قرآن عالم گیر قانون کے تسلیم کرنے کو انسان کا برترین فرض قرار دیتا ہے۔ وہ اس کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ اسی قانون کے مطابق وہ اپنی زندگی بسر کرے، اور ایک ایسی حساس، ذی عقل، ذمہ دار

ہستی کی طرح، جس کا محرک جذبہ لیکن جس کی ہادی روح ہے، اپنا توازن قائم رکھتے۔ اشیار کے اسی نظام الہٰی کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا اسلام ہے۔ یہ دینِ فطرت ہے۔

کیا یہی وہ چیز نہیں جس کے حصول کی انسان اپنے وجود کی ابتدائی منزل ہی سے کوشش کر رہا تھا؟ کیا یہی وہ چیز نہیں جس کی رواقیہ کو تلاش تھی؟ اور کیا یہی وہ چیز نہیں جس کی تعلیم دینے کے لئے تمام مذاہب اور تمام نظاماتِ فلسفہ دنیا میں جلوہ افروز ہوئے؟ اور کیا یہی وہ چیز نہیں جو درحقیقت تہذیب، تمدن وغیرہ جیسے الفاظ سے ہماری مراد ہوتی ہے۔ یعنی اُن برترین و بہترین معیارات کے مطابق زندگی بسر کرنا جن کے انسان قابل ہے؟

قرآن، وحی الہٰی: ہم مسلمانوں کا ایمان ہے کہ قرآن کا ماخذ وحیِ الہٰی ہے، اور ہم ان تمام تنقیدی آرار کو کوئی اہمیت نہیں دیتے جن کا انطباق زیادہ مناسبت کے ساتھ ان کتابوں پر ہو سکتا ہے جو انسانوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ لیکن دوسرے مذہب کے لوگ، جن کا یہ خیال ہے اور جو اپنے اس خیال کا الفاظ میں بھی اظہار کرتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) قرآن کو خود پیغمبر ہی نے مرتب کر لیا تھا، ایک نہایت سخت مشکل میں پھنس جاتے ہیں جب انھیں یہ سمجھانا پڑتا ہے کہ ساتویں صدی کے ایک امی عرب کے لئے، جس نے مہذب اقوام کے ادب و فلسفہ سے واقف کار علمار سے کبھی ملاقات نہ کی ہو، یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ حیاتِ انسانی اور اس کی اہم ضروریات کے متعلق اتنا عمیق و ہمہ گیر نقطۂ نظر اختیار کرے اور حیاتِ حسنہ کی تمام اہم تفصیلات بیان کر دے اور تمام نظامات کی اخلاقیات کو کردار کے مختصر اور متین جملوں میں، امر و نواہی کی عملی شکل میں مرتب کر دے؟ یہ کیا بات ہے کہ زمانۂ قدیم یا زمانۂ جدید کا کوئی دوسرا مصنف ایسی کتاب نہ پیش کر سکا جس کی تعلیم سے تہذیب و تمدن کی ایک نئی دنیا پیدا ہوئی ہو؟ یا ایک لفظ میں یوں کہو کہ اس واقعہ کی کس طرح توجیہہ کی جائے کہ یہ غیر متمدن ذہن اپنی باطن کی گہرائیوں سے ایسے الفاظ نکال سکا جو نور کے شعلوں کے مانند

ہیں اور جو روح کو مسخر کرنے والی آوازوں سے معمور ہیں؟ یا تو ہمیں قرآنِ مقدس، کو منزل من اللہ سمجھنا ہوگا یا خود پیغمبر ہی کو!

اسلام ایک کامل تہذیب ہے: اس کتابِ مقدس نے اور پیغمبر نے دنیا کو کیا دیا؟ "اسلام" جو بقول ڈاکٹر گب "محض نظامِ دینیات ہی نہیں بلکہ اس سے بہت زیادہ ہے؛ یہ ایک کامل تہذیب ہے۔ اگر ہم متوازی حدود کی تلاش کریں تو ہمیں بجائے نصرانیت کے بلاد نصرانیہ اور بجائے مذہب کنفیوشس کے چین استعمال کرنا ہوگا۔ اسلام میں بہت سارے تمدنوں کا اختلاط ہوا ہے جو ایک ہی دینی نقطہ کے اطراف نشو ونما پائے ہیں، یا اکثر حالتوں میں کم وبیش تغیرات و ترمیمات کے ساتھ اس سے ملحق ہوگئے ہیں۔ یہ ایک ایسا مرکب ہے جو اپنی سیاسی معاشری و معاشیاتی ساخت کے لحاظ سے، اپنے تصورِ قانون میں، اپنے اخلاقیاتی نقطۂ نگاہ میں، اپنے عقلی میلانات۔ اور فکر وعمل کی عادات میں اپنی ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں اسیں اُن لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد شامل ہے جو گو قومیت، زبان، سیرت اور موروثی میلانات کے لحاظ سے آپس میں اختلاف رکھتے ہیں تاہم نہ صرف ایک مشترک ایمان واعتقاد کے حلقہ سے بندھے ہوئے ہیں بلکہ ایک مشترک تمدن میں حصہ لے کر، ایک مشترک قانون کی اطاعت کرکے اور ایک مشترک روایت کو اختیار کرکے ایک دوسرے کے ساتھ اور زیادہ قوت سے مربوط و وابستہ ہیں[1]"۔

گبن اور اسلام: گبن بانی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق لکھتا ہے:

"جو چیز حیرت کے قابل ہے وہ دراصل آنحضرت صلعم کے مذہب کی بقاو دوام ہے نہ کہ اس کی ترویج و اشاعت: وہی پاک و کامل نقش جو مکہ اور مدینہ میں ثبت ہے اسی کو بارہ صدیوں کے انقلابات کے بعد بھی ہندوستانی، افریقی اور ترکی حلقہ

---

[1] اقتباس از Whither Islam مصنفہ ایچ، اے، آر، گب

بگوشانِ اسلام نے محفوظ رکھا ہے! اگر عیسیٰ علیہ السلام کے حواری حضرت پال اور حضرت پیٹر، قصر پوپ تشریف لاسکیں تو ممکن ہے کہ وہ اس اِلٰہ، کا نام دریافت کریں جس کی اس شاندار کلیسا میں ان پراسرار رسوم کے ساتھ عبادت کی جارہی ہے! آکسفورڈ اور جی نیوا آکر ان کی حیرت میں کچھ کمی ہوگی، لیکن پھر بھی ان کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ وہ کلیسا کی تعلیم کا مطالعہ کریں اور اپنی ہی تحریرات اور اپنے آقا کے اقوال پر صحیح العقیدہ مفسرین نے جو کچھ لکھا ہے اس کو پڑھیں لیکن سینٹ صوفیہ کی مسجد، باوجود اپنی بڑھی ہوئی شان وشوکت اور طول وعرض کے، اسی فقیرانہ مسجد کی نمائندگی کرتی ہے جس کی تعمیر محمدؐ کے ہاتھوں مدینہ میں ہوئی تھی۔ اپنے ایمان وعقیدہ کے معروض کو انسانی حواس وتخیل کی سطح پر کھینچ لانے کی گمراہ کن ترغیب کا مسلمانوں نے ہمیشہ کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا: "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ"۔ یہ ہے اسلام کا سادہ اور ناقابلِ تغیر کلمۂ ایمان۔ خدا کے عقلی تصور کو مرئی صنم میں مجسم کرکے کبھی ذلیل نہیں کیا گیا۔ پیغمبر کا ادب کبھی اس طرح نہیں کیا گیا کہ فضیلتِ بشری کے حدود سے انھیں بڑھا دیا جائے، اور ان کے زندہ نصائح نے ان کے پیروؤں کے تشکر وامتنان کو عقل ومذہب کے حدود کے اندر ہی روک رکھا۔"

لائٹنر کا خراجِ تحسین اسلام کی بارگاہ میں: جو کچھ میں نے کہا ہے اس کی توضیح مندرجہ ذیل اقتباسات سے بھی ہوسکتی ہے جو جی ڈبلیو لائٹنر کی کتاب Essays on Mohammadanism سے لئے گئے ہیں جس کو اس نے پچاس سال پہلے لکھا تھا:

"حقیقت میں مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر لوگ صحیح معنی میں محبت کرنا سیکھیں تو انکی دوسرے مذاہب کے متعلق وہ رائے نہ ہوگی جو وہ اب رکھتے ہیں، اور شاید وہ یہ کوشش کرینگے کہ بجائے

---

[1] حوالہ اگلے صفحہ پر دیکھئے

اس کے کہ ان مذاہب کے مخالفوں کی منقولہ متعصبانہ آرا، پر بھروسہ کرلیں ان کے متعلق ان ہی کے اصلی آخذ سے اپنا علم حاصل کریں،

"معیت الہٰی کا ادراک یعنی روزمرہ زندگی میں خدا کی یافت تاکہ نفسِ مطمئنہ، حاصل ہو جائے، اور مشیت الہٰی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا۔ ان اقدار کی تلاش کا ہم کو بھی دعویٰ ہے لیکن اسلام میں اس دعوی کا عمل میں تحقق ہوتا ہے اور یہی اس مذہب کی عمارت کا سنگ اساس ہے"

ایک معنی میں اسلام یہودیت و نصرانیت کے مانند ہے اور ایک معنی میں نہیں معیتِ الہٰی کے ادراک اور اپنے تمام افعال میں خدا کی یافت کی تعلیم اس میں شک نہیں کہ ان مذاہب کے تمام پیغمبروں نے دی تھی اور اس معنی میں وہ مسلم تھے، یعنی مذہب "اسلام" کے قائل تھے۔

محمد صلعم کا ملہم من اللہ ہونا | لیکن جس قدر بھی مجھے یہودیت و نصرانیت کا علم ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ محمد صلعم نے جس نظام کی تعلیم دی وہ محض تقلیدی یا انتخابی نہ تھا؛ وہ مُلہم من اللہ بھی تھا۔ بشرطیکہ یہ مان لیا جائے کہ مبدر خیر سے الہام ہو سکتا ہے۔ نہایت عاجزی کے ساتھ میں یہ کہنے کی جرارت کرسکتا ہوں کہ اگر ایثارِ نفس، حصولِ مقصد میں صدق، اپنی رسالت پر غیر متزلزل یقین، موجودہ غلطیوں اور خطاؤں کی دریافت میں حیرت انگیز بصیرت، اور ان کے دفیہ کے لئے بہترین ذرائع کا ادراک اور ان کا استعمال، الہام کے خارجی و مرئی علامات ہیں تو محمدؐ کی رسالت بھی یقیناً مُلہم من اللہ تھی،

اسلام کی ہمہ گیری: | "محمدؐ کا یہ خیال کہ حضرت ابراہیمؑ کے مذہب کو اپنے ہی لوگوں تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ اس کو ساری دنیا کے لئے عام کر دیا جائے، بنی نوع کے کروڑہا افراد کو ایک اعلیٰ قسم کے تمدن و تہذیب میں داخل کرنے کا ذریعہ بن گیا، ورنہ یہ لوگ تو بربریت میں مبتلا رہتے یا پھر انھیں وہ اخوت نصیب نہ ہوتی جس کی اسلام نہ صرف تعلیم دیتا ہے بلکہ اس پر عمل بھی کرتا ہے"

لہ گبن: Decline & Fall of the Roman Empire صفحہ ۳۶۵

"میری رائے میں اس سوال کا کہ اسلام کیا ہے اس سے بہتر طریقہ پر جواب نہیں دیا جا سکتا کہ اسلام یہودیت ہے جس میں تبلیغ مذہب کا اضافہ کر دیا گیا ہے، اور نصرانیت ہے جس میں سے سینٹ پال کی تعلیم خارج کر دی گئی ہے۔ یہ تو صرف اس کے نظریہ کی حد تک صحیح ہے اور جہاں تک عمل کا تعلق ہے یہ اس نصرانیت جدیدہ سے کہیں زیادہ ہے جو ہمیں اپنی مصنوعی یورپی صورت میں اب ملتی ہے۔ یہ کوہِ زیتون والے وعظ کو عملی جامہ پہناتا ہے۔"

حریت و مساوات "اسلامی معاشرہ میں ہمیں کہیں بھی امیر و غریب کا حاسدانہ امتیاز نظر نہیں آتا حتیٰ کہ مسلمان غلام بھی نہ صرف خاندان کا ایک رکن ہوتا ہے بلکہ اس کو ایک انگریز قلاش کی بہ نسبت کہیں زیادہ مواقع اس امر کے حاصل ہوتے ہیں کہ وہ معاشرہ یا حکومت میں کسی اعلیٰ مرتبہ پر ترقی کرے۔

"اگر مغربی معاشرہ کی تعمیر اسلام کی اساس پر ہوتی تو یورپ میں نہ عدمیہ ہی کا وجود پایا جاتا اور نہ اشتراکیہ کا؛ کیونکہ یہاں انسان کو مایوس ہونا نہیں سکھلایا جاتا، جیسا کہ ہماری تہذیب کی یہی کوشش، غایت اور نتیجہ ہوتا ہے۔"

تعدّد ازدواج | "اس غیر محدود تعدّدِ ازدواج کو، جو صورت حالات کا ذمہ دار تھا، پیغمبر اسلام نے روک دیا؛ انھوں نے اِذن دیا کہ انسان صرف دو تین یا چار بیویوں سے عقد کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ ان سب کے ساتھ ویسے ہی انصاف کی زندگی بسر کرے۔

اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اس کو صرف ایک بیوی کی اجازت تھی۔ اب چونکہ کوئی شخص بطور قاعدہ دو یا زیادہ بیویوں کے ساتھ اسی انصاف سے نہیں رہ سکتا لہٰذا پیغمبرِ اسلام کے قانون کی

روح صاف طور پر اسی طرف مائل نظر آتی ہے کہ ایک بیوی کے ساتھ شادی کی جائے۔

مجھے یقین ہے کہ انھوں نے بڑی عمر میں جو بہت سے عقد کئے اس کا اصلی سبب ہمدردی اور اپنے ان متبعین کی بیواؤں کی حفاظت تھی جنھوں نے دین کی مدافعت میں اپنی جانیں قربان کردی تھیں۔

عورت کا رتبہ: "آپ نے عورت کو مملوکیت کے درجہ سے نکال کر مالکیت کا درجہ بخشا، اور اس کو پہلا "شرعی" وارث قرار دیا جس کے اغراض کی حفاظت قانونِ اسلام پر واجب ہے۔

مسلمان شادی شدہ عورت انگریز شادی شدہ عورت سے قانوناً بہتر مرتبہ رکھتی ہے اور پیدائش، نکاح یا موت کے معاملات میں شہادت دے سکتی ہے اور یہ وہ حق ہے جس سے جمہوریہ فرانس کی عورت اب بھی محروم ہے۔"

اسلام کا معیارِ اخلاق: "مسلمانوں میں نہ شراب خانے ہوتے ہیں، نہ قمار خانے اور نہ کسبی خانے، فحشی کو قانونی طور پر جائز قرار دینے کا ان کے ہاں کوئی تصور نہیں؛ نہ ہی ان کی گفتگو تو وہ بطور قاعدہ اکثر یورپ کے باشندوں سے کہیں زیادہ نفیس، اور پاکیزہ ہوتی ہے۔ میں نے مدرسوں اور کالجوں میں نوجوان مسلمان لڑکوں کو دیکھا ہے؛ ان کی چال چلن اور ان کی گفتگو انگریز نوجوانوں سے کہیں بہتر ہوتی ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ اکثر دفعہ ثانی الذکر طبقہ کی گفتگو ایسی ہوا کرتی ہے کہ اس پر ایک اسلامی ملک میں سزا دی جا سکتی ہے۔"

جہاد کے معنی: مذہبِ اسلام کے متعلق یہ جو فرض کیا جاتا ہے کہ یہ عدیم التغیر ہے تو یاد رکھو کہ قرآن کی

توجیہہ میں اتنی آزادی حاصل ہے کہ اسلام ہر فرقہ اور ہر ملک کے حالات کے مطابق بنایا جاسکتا ہے، مثلاً قرآن کی توجیہہ کے لئے یہ جو قانون وضع کیا گیا ہے، کہ مشروط حکم کو مطلق حکم پر تقدم ہے، ایسا ہی کہ اس سے ضمیر کی ایک معقول آزادی حاصل ہوتی ہے۔ اس مثال پر غور کرو:

"کافروں سے جنگ کرو" ایک مطلق حکم ہے؛ "کافروں سے جنگ کرو اگر وہ تم پر پہلے حملہ کریں" ایک مشروط حکم ہے، لہذا کفار کے خلاف جہاد کے سوال کا تعین کرتے وقت، (جس کے متعلق بڑی غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے) ہمیں پہلے اسی مشروط حکم کا لحاظ کرنا چاہیئے۔ درحقیقت اس قسم کی جنگ اس وقت تک جائز نہیں قرار دی جاسکتی جب تک کہ یہ حفاظتِ ذاتی کی غرض سے ان لوگوں سے نہ لڑی جائے جو مسلمانوں پر ظلم کرتے ہیں اور ان کو محض اس وجہ سے کہ یہ اللہ واحد پر ایمان رکھتے ہیں ان کے گھروں سے باہر نکال دیتے ہیں جیسے کہ ان مسلمان مہاجرین کی حالت تھی جنھوں نے حبشہ میں پناہ حاصل کی تھی۔

اسلام میں رواداری: جہاں تک مذہبی رواداری کا تعلق ہے مسلمانوں میں بہر حال نصرانی ممالک کی بہ نسبت، یہ عملی طور پر کہیں زیادہ پائی جاتی ہے؛ اگر ایسا نہ ہوتا تو اہل ارمینیا و یونان اور یہودی فرقے اپنی خود مختاری، مذہب و زبان (مثلاً) ترکوں کی حکومت کے تحت کیسے محفوظ رکھ سکتے؟ ترکوں کی حکومت کے متعلق تو میں اپنے شخصی علم کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اس سے نصرانی قوانین موضوعہ کو تحمل، رواداری اور انسانیت کے بہت سارے سبق مل سکتے ہیں۔"

"میں اس خطبہ کو اس سے بہتر طریقہ پر ختم نہیں کرسکتا کہ اس بات پر زور دوں کہ یہودیت و نصرانیت و اسلام مذہب ہونے کی حیثیت سے بھائی بھائی ہیں: ان کا ایک ہی مشترک مبدء و ماخذ ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ ایک دن وہ آئے گا جب نصاریٰ یہ پائیں گے کہ حضرت محمدؐ

صلی اللہ علیہ وسلم کا احترام کرتے ہیں وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی کا زیادہ احترام کر رہے ہیں۔"
"اسلام اور نصرانیت ایک مشترک اساس رکھتے ہیں۔ وہ شخص حضرت عیسیٰ کا سچا پیرو ہے
جو ان صداقتوں کی عزت و احترام کرتا ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیں۔"

باب دوم

"اِسلام کی غلط تعبیر"

مذہب اور تعصب: | یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ بہت سارے مذہب کے شیدائی جو قرانی تعلیم کی توضیح کا دعویٰ کرتے ہیں نہ صرف تنگ نظر اور متعصب ہوتے ہیں بلکہ صداقت و خلوص کی بھی زیادہ پرواہ نہیں کرتے۔ اپنی مفروضہ راسخ الاعتقادی اور مذہبی رسوم اور لباس و طہارت کی بعض غیر ضروری جزئیات کی پابندی کی وجہ سے ان میں برتری کا ایک بیجا احساس پیدا ہوجاتا ہے اور وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ نجات کے صرف وہی مستحق ہیں، اور اس طرح ان کا خیال مذہب کے اصلی اصول سے ہٹ جاتا ہے جو صداقت، خلوص، صفائیٔ قلب، بالفظ واحد عملِ صالح ہے۔

بعض تقدس مآب حضرات کا خدا کے متعلق تصور رحم، کرم، عفو نہیں ہوتا بلکہ وہ خدا کو قہر و غضب و انتقام کا مجسمہ سمجھتے ہیں۔ اس کے غضب پر زیادہ غور کرتے ہیں نہ کہ اس کے فضل، رحم اور مغفرت پر۔ میں خدا کو غصہ یا غضب سے متصف نہیں سمجھ سکتا کیونکہ غصہ انسانی بلکہ محض حیوانی جذبہ ہے اور خدا اس سے منزہ ہے۔ اس کی صفات تو وہی ہونی چاہئیں جو انسان میں نہایت پاک اور بہتر اور بلند تر بھی جاتی ہیں۔ غصہ اور انتقام سے تو آزردگی کا اظہار ہوتا ہے اور یہ اپنی ماہیت کے لحاظ سے ایک شخصی احساس ہے۔ خدا کا کوئی فعل اس کے لئے شخصی نہیں ہوتا خواہ وہ ہمارے

لئے کتنا ہی شخصی کیوں نہ ہو۔ اس کا ارادہ، اس کا حکم اور اس کا فعل سب ایک ہیں اور وہ قانون کلی ہیں۔ اور اس قانون میں عدل بھی ہے اور رحم بھی اور عفو بھی جو انتقام سے درگزر تا ہے۔

یہ ہے وہ تاثر جو قرآن کریم کے مطالعہ سے میرے قلب پر مرتب ہوتا ہے۔ وہ ذاتِ الٰہی کو انسانی لباس میں پیش کرتا ہے، اور اس میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ ایک مہربان باپ کی ہے جو اپنے آوارہ بچوں کو تنبیہ و توبیخ کرتا ہے تاکہ اُنھیں راہِ صواب کی طرف ہدایت کرے۔ اس میں بعض عبارتیں ایسی ملتی ہیں، جن کی رقت انگیز شفقت اور الٰہی حلم سے ہماری آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ اور عجیب بات تو یہ ہے کہ یہ عقل ہی کی سادہ اور صاف زبان ہے گو بعض جگہ استعارات کی جھلک نمایاں ہے؛ اور اس کا مقصد خیر و شر، خطا و صواب کے ابدی امتیاز کو پیش کر کے بنی نوع انسان کو نور کی طرف ہدایت کرنا ہے۔ یہ دہشت نہیں پیدا کرتا بلکہ اُمید کی تخم ریزی کرتا ہے جسکے ساتھ سعادت و مسرتِ کامل کی توقع ہوتی ہے، وہ ایمان کی تطہیر کرتا ہے اور اُس کو تقویت دیتا ہے۔

یہ ایک غلط خیال ہے (جس کی تلقین اکثر تنگ نظرانہ تعصب کی جانب سے ہوتی ہے) کہ قرآن دوسرے مذاہب کے پیرووں کو مشرک کہہ کر اُن کے ساتھ تذلیل و تحقیر کا برتاؤ کرتا ہے، وہ ایسا نہیں کرتا، وہ انھیں اپنی امان میں لے کر خدا کا کلام اور اسلام کے حقائق و دلائل سناتا ہے، اگر وہ قبول نہ بھی کریں تو ان کو نہیں ستاتا بلکہ کسی امن کی جگہ پہونچا دیتا ہے جہاں وہ مامون و مطمئن ہو جاتے ہیں، اگر اس کے بعد بھی وہ عناد برتیں تو قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ کے بعد دین میں کوئی اکراہ نہیں
وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُونَ ٥ (پ ع ۱) قرآن ہمیشہ اِس امر پر زور دیتا ہے کہ تمام انسان اپنے اعمال کے مطابق سزا و جزا پائیں گے: "لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ"

مشرک، قرآنی معنی کے لحاظ سے وہ ہیں جو آلہۂ کثیرہ کی پرستش کرتے ہیں اور وحدانیتِ الٰہیہ کا انکار

کرتے ہیں۔ کیونکہ اس انکار سے لازم آتا ہے کہ کائنات اور اس کے سارے موجودات اور قویٰ کے باہمی ربط کے متعلق ان کا خیال بالکل فاسد ہے۔ یہ ہستی کی وحدت اور قانونِ الٰہی کی کلیت کو تباہ کردیتا ہے۔ اس خدا کے سامنے جو وحدت و کلیت کا مظہر اور برترین قوت ہے مشرکین کے الٰہۂ باطلہ فدار اور غاصب نظر آنے چاہئے اور ان کے پرستار باغی اور سرکش! کیا انہیں کفار قرار دینے میں کوئی ناانصافی ہو رہی ہے؟ تاہم قرآن دوسرے مذاہب و عقائد کے ساتھ تحمل اور رواداری کے ساتھ پیش آنے کا حکم دیتا ہے: ”وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ“ (پ ۷ ع ۱۹)

قرآن کے خلاف فرقہ پرستانہ تعصب: تجربہ ہمیں سکھلاتا ہے کہ تعلیم لازماً ذہن کو تعصب سے پاک نہیں کرتی، اور یہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ ذہنِ انسانی جس چیز پر یقین کرنا چاہتا ہے اس کی تائید میں دلائل ڈھونڈھ ہی لیتا ہے۔ اپنے مطلب کے لئے باطل دلائل ڈھونڈھ نکالنے میں وہ کامل مہارت رکھتا ہے اور جب ایک دفعہ ان کی کھوج میں پڑ جاتا ہے تو پھر صحیح دلائل اس کی آنکھوں کے سامنے ہوں بھی تو وہ اس کو نظر نہیں آتے! ممکن ہے کہ یہ قرآن کے ان فاضل مفسرین پر چوٹ ہو جو نہایت مبرہن اور اُجاگر بات کو بھی مغلق اور مبہم بنا دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، یا یہ چوٹ اُن بعض غیر ملکی علماء کی تصانیف پر ہو جنھوں نے یہ محسوس کر لیا ہے کہ قرآن اور پیغمبر اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسّلام) پر خامہ فرسائی ان کا فریضہ ہے۔ ان کے بظاہر پُرسکون اور بے لاگ تنقید کے پردہ میں ان کے نیم مستور خبثِ باطن اور غصہ کی جھلکیاں صاف طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ قرآن کے کسی ترجمے کے مقدمہ کو لو اور اس کے کسی صفحہ پر نظر ڈالو، تمہیں اس کا کچھ نہ کچھ اثر دکھائی دیگا بعض حالتوں میں تمہیں ادبی کمال کا ایک خاص نتیجہ خیز نمونہ ملیگا بغیر ظاہر کردہ خیالات سے مالا مال ہوگا جسکے مافی الضمیر عجیب و غریب معنی کے حامل ہونگے۔ بعض دفعہ ان کے مفہوم کا سمجھنا بھی مشکل ہوتا ہے۔

بعض دفعہ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صداقت کے مطلق معنی کے لحاظ سے پیغمبر نہیں تھے! سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر صداقت کے مطلق معنی ہیں کیا!

مذہبِ اسلام اس قدر سادہ اور فطری واقع ہوا ہے کہ اس کو کسی نوفلاطونی سریّت کے مابعد الطبیعیاتی نظریہ کی تائید کی حاجت نہیں۔ اس کا دعوتی کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے: اللہ ایک ہے، قادرِ مطلق ہے، عادل اور رحیم ہے، کائنات کی ساری چیزوں کا خالق ہے، یہی اللہ ہمارا معبود ہے جس کی ہم عبادت کرتے ہیں اور جس سے ہم استعانت طلب کرتے ہیں اور محمدؐ اس کے رسول ہیں۔ وہ اس کی مخلوق ہیں، اس کی وحدت، سطوت و عظمت، رحمت و نصفت والے پیام کے حامل ہیں۔ انھوں نے اس کے پیام کو ایک ایسی دنیا کے سامنے پیش کیا جہاں لوگ ان پتھروں کے آگے سرِ عبودیت خم کر رہے تھے جن کو ان ہی کے ہاتھوں نے بتوں کی شکلوں میں گھڑا تھا۔ پیام پہونچا دیا گیا۔ اور یہ قبول کر لیا گیا، چند ہی سال کے عرصہ میں اس نے جزیرۂ عرب کی شکل بدل دی، فکر وعمل کی ایک نئی دنیا کی بنیاد ڈالی، اور ایک نئی تہذیب کا ڈھانچہ تیار کر دیا انسانی ذہن ایک بڑی فاش غلطی کو بتوں کی بھدی شکل میں مذہب کے نام سے قبول کر رہا تھا۔ ایک جوانمرد نے اس غلطی کو اس کی برہنہ کریہہ صورت میں دیکھا، جرأت کے ساتھ اس کا اعلان کیا، اور اس کے خلاف جنگ چھیڑ دی یہاں تک کہ اس نے اس کو تباہ کر دیا اور اس کی جگہ ایک سادہ اور شاندار صداقت رکھی کہ غیر مرئی خدا واحد ہے، سرمدی ہے اور قادرِ مطلق ہے۔ اسی جوانمرد میں اپنے ہموطنوں سے کہنے کی یہ جرأت بھی تھی کہ "یہ صداقت ہے تمھیں اس پر ایمان لانا پڑیگا! مجھے خالقِ ارض وسما نے حکم دیا ہے کہ ساری دنیا میں اس کو پہونچا دوں، میں اس کا رسول ہوں،" کیا اس میں کوئی فریب تھا، کوئی غلط تعلیم تھی، یا کوئی ایسا دعویٰ جس کو ان کی ساری زندگی نے حق بجانب ثابت نہیں کیا؟

قرآن کچھ نہیں اگر وہ اس عظیم الشان اخلاقی و روحانی تعلیم کو انسان کے کانوں تک نہیں

پہونچا تا کہ "تمھیں اپنی نجات صرف اپنے ایمان اور عمل صالح کے ذریعہ حاصل کرنی چاہئے۔ اگر تم نیک عمل کرتے ہو تو یہ تمہاری ہی روح کے لئے ہے اور تمھیں اس کا جواب دینا ہوگا۔"

"اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ" (پ ۲۵ ع ۱۸،۱۹)

پیغمبر اسلام صداقتوں کو دریافت کرنے کی کوشش نہیں فرما رہے تھے۔ کلی اور عالمگیر نوعیت کی سادہ صداقتیں ان کے قلب پر اس عظیم الشان قوت کی طرف سے القا ہو رہی تھیں جو ساری کائنات پر حکمرانی کر رہی ہے۔ ان کا کام صرف یہ تھا کہ لوگ ان پر ایمان لے آئیں اور ان پر عمل کریں۔ کسی پیغمبر نے اس سے زیادہ نہیں کیا۔

پیغمبر اسلام نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ ایک نئے مذہب کو پیش کر رہے ہیں، نہ ہی حضرت عیسیٰؑ نے ایسا کیا۔ ان دونوں کا یہی دعویٰ تھا کہ وہ قدیم مذہب کو اس کی اصلی حالت میں پیش کرنے پر مامور ہیں۔ قرآن اس پیامِ الٰہی کی توثیق ہے جو حضرت موسیٰؑ و حضرت عیسیٰؑ کے ذریعہ بھیجا گیا تھا؛ اسلام ایک جدید مذہب ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا کیونکہ یہ قدیم مذہب ہی کو زیادہ واضح شکل میں پیش کر دیتا ہے۔



باب سوم

وحی اور نبوّت

"نبی" اور "وحی" کے الفاظ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "خدا بندے پر کس طرح ظاہر ہوتا ہے؟" اپنی نشانیوں کے ذریعہ جن کا ہمیں وجدانی فہم حاصل ہوتا ہے! ان صورتوں میں بھی جہاں خدا اور بندے کے درمیان راست تعلق ہوتا ہے (جیسے ان مذاہب میں جن کا مدار وحی پر ہی) خدا کا بندے پر ظاہر ہونا اسی طریقہ سے ہو سکتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ انسان کے ذہن میں، جو ایک غیر معمولی عروج کی حالت میں ہوتا ہے، کہیں سے ایک پیام آتا ہے اور بعض صداقتیں اس پر کشوف ہوتی ہیں۔ یہ پیام الفاظ کے جامہ میں ملبوس ہوتا ہے، لیکن یہ معمولی زبان کے الفاظ نہیں ہوتے، ان میں ایک جلال ہوتا ہے، جوش اور ولولہ ہوتا ہے جو معمولی زبان میں عموماً مفقود ہوتا ہے وہ شاعرانہ اور پیغمبرانہ ہوتے ہیں، وہ روح کو تڑپاتے اور قلب کو گرماتے ہیں، اِسی لئے سُننے والوں کی رگ و پے میں سرایت کر جاتے ہیں۔

کتبِ مقدسہ انسان پر اسی طرح اتری ہیں اور یہی وہ طریقہ ہے جو ہماری سمجھ میں آسکتا ہے ان دنوں کوئی یہ ماننے کو تیار نہیں کہ کتابِ الٰہی بنی بنائی آسمان سے اُتاری گئی گویا کسی مطبع والے نے چھاپ کر ہمارے یہاں بھیجی ہے۔ کیا کوئی شخص یہ فرض کر سکتا ہے کہ قادرِ مطلق نے زمانۂ قدیم کے

رشی یا انبیاء کے ہاں: جو وحشی گلہ بانی کرنے والی نا اہل قوم سے تعلق رکھتے تھے، اپنا تحریری پیام بھیجنا ضروری سمجھا ہوگا؟ وحی و الہام کے متعلق ہمارا تصور یہ ہے: فکر اور جذبہ کی ایک عظیم الشان اور ناقابلِ مدافعت موج اٹھتی ہے اور پیغمبر کے قلب پر چھا جاتی ہے، اب اس کی نظر کے آگے ایک عالم کھل جاتا ہے جو اس دنیا سے کہیں زیادہ شاندار اور کامل ہوتا ہے۔ اس کے تمام ملکات میں ایک اشتداد پیدا ہوتا ہے، وہ ایک پُراسرار قوت کے تسلط میں آجاتا ہے۔ اور اس کے قلب میں یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ یہ پیغامِ نجات راست خدا کی جانب سے بطورِ الہام آیا ہے، اُس کو فوراً ابنائے زمانہ کے کانوں تک پہونچا دیا جانا چاہیئے۔

وحی کو القا و الہام کے معنی میں سمجھا جائے تو اُس کے مختلف درجے ہوتے ہیں۔ اس کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ اس میں ایک طرف تو کتب مقدسہ کا نزول شامل ہے اور دوسری طرف کسی بھی عمدہ خیال کا پیدا ہونا جو ایک شعاعِ مستنیر کی طرح ہمارے ذہن میں داخل ہوتا ہے اور اس کی تاریکیوں کو نور میں مبدل کر دیتا ہے۔ القا کے دوسرے معنی کو پیشِ نظر رکھ کر ہی شاعروں فلسفیوں، عارفوں اور مصلحوں کا کام سمجھ میں آتا ہے جن میں سے ہر ایک اپنے طریقہ سے صداقت و جمال کا انکشاف کرتے ہیں اور ہماری دنیوی زندگی کو نورانی، پاک اور خوشگوار بناتے ہیں۔

فطرت کے طریقوں کی بصیرت: فطرت کے طریقوں کے مشاہدہ کے لئے بعض کو خدائے عجیب و غریب بصیرت عطا فرمائی ہے، ان پر اس کے اسرار و غموض وجدان کے ذریعہ منکشف ہوتے ہیں۔ مشاہدۂ فطرت کے بعد اگر ان کے جذبات میں ترنگ پیدا ہو جائے تو وہ شاعر اور پیمبر بن جاتے ہیں، لیکن اگر ان کی فطرت زیادہ حساس واقع نہ ہوئی ہو تو پھر وہ ان اسرار و رموز کا محض انفعالی طور پر مشاہدہ کرتے ہیں اور ورطۂ تحیّر و تفکّر میں گم ہو جاتے ہیں۔

یہ چشمِ بصیرت فطرت کا ایک عطیہ ہوتی ہے۔ دائمی استعمال سے اس کو سنوارا جا سکتا ہے

اور زیادہ تیز اور موثر بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن انسانی ذرائع سے اس کا حصول ممکن نہیں۔ شاعر پیدا ہوتا ہے، بنایا نہیں جاتا، یہی حال پیغمبر کا ہے اور یہی حال سچے فلسفی یا عارف کا۔ وہ اس عطیہ کو لے کر دنیا میں آتا ہے، گو یہ ممکن ہے کہ اس عطیہ کا خود اس کے ذہن پر انکشاف ہونے میں ایک عرصۂ دراز لگے یا نصف عمر گزر جائے۔ جب اس کا اس پر اور دنیا پر انکشاف ہوجاتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ یہ نئی قوت کا حصول ہے، لیکن یہ آغازِ کائنات ہی سے بالقویٰ اس میں موجود تھی۔ ہم اس کو دنیا میں کسی نام سے پکاریں وہ ایک شعاعِ الٰہی ہے، حق تعالیٰ کی کسی صفت کا انعکاس یا ظل جو بعض غیر متوقع مقامات میں دکھائی دیتا ہے۔

اعلیٰ ترین معنی میں مذہب ذہنِ انسانی میں یہ یقین پیدا کرتا ہے کہ ایک ہستیٔ برتر کی رہنمائی میں کائنات میں ایک اخلاقی نظم پایا جاتا ہے لیکن یہ یقین کسی جدلیاتی طریقہ سے پیدا نہیں کیا جاتا۔ مذہب بغیر کسی منطقی توجیہہ کے ہم میں ایمان یا یقین پیدا کرتا ہے۔ یہ ہمارے کسی پوشیدہ ملکہ کو متاثر کرتا ہے۔ جو بعینہٖ فہم نہیں۔ مذہب کے زیر اثر ہم جو صداقت کا وقوف حاصل کرتے ہیں وہ عقلی نہیں بلکہ جبلی ہوتا ہے؛ اسی لئے ذہن نہ کسی فلسفیانہ تحقیق کا محتاج ہوتا ہے نہ اس پر بھروسہ کرتا ہے، گو اپنے نتائج کی تائید و تصدیق کے لئے کبھی کبھی وہ فلسفیانہ طریقۂ عمل کا استعمال کرسکتا ہے۔

وجودِ باری پر ایمان انسان کی فطرت میں داخل ہے، لیکن اس کو ایک متین شکل عطا کرنے اور اس کی حقیقت کو نمایاں و مبرہن کرنے کے لئے مذہب کے اقتدار و سند کی ضرورت ہے۔ اور ہر مذہب جو انسان پر بطور وحی نازل ہوا ہے حکم الٰہی کی تائید و سند رکھنے کا دعویٰ کرسکتا ہے۔ اور جب تک ہمیں یہ نہ معلوم ہوجائے کہ کن مخصوص ذرائع سے خدا اور بندے کے درمیان رابطہ قائم ہوتا ہے ان مذاہب کے الٰہی مآخذ پر شک کرنا بیہودہ پن ہے۔ جہاں تک

ہمیں علم ہے، وقتِ واحد میں ایک ہی منتخب فرد کو وحی سے سرفراز فرمایا گیا نہ کہ کسی قبیلہ یا قوم کے تمام افراد کو ایک ساتھ۔ اور اسی منتخب فرد کو ابنائے زمانہ کے پاس رسول بنا کر بھیجا گیا۔ اس کے لئے وحی گویا ایک القا تھی، اس کے من اللہ ہونے میں کسی شک کی گنجائش تھی نہ شبہ کی۔ گویا وہ ایک نور تھا جس کی ضیا پاشی نے اس کے قلب کو روشن کر دیا اور وجود کی حقیقت اس پر منکشف ہو گئی، یا یوں کہو کہ ایک بند دروازہ تھا جو ناگہاں کھُل گیا اور وہ چیزیں نظر آنے لگیں جن کی رویت اب تک محال تھی۔ ہر وہ روح جو وجودِ سرمدی کے نظارے کے اشتیاق میں رہا کرتی ہے تجلی کے اِن مختصر لمحوں کو ضرور پاتی ہے جس کی تنویر سے تمام ظلمتیں کافور ہو جاتی ہیں۔ معمولی زندگی میں اس تجلی کا ظہور عام طور پر نیک ہیجانات کی صورت میں ہوتا ہے۔ غیر معمولی ذہین تخلیقی اور اختراعی قوت رکھنے والوں میں یہ نئی اور نادر صورتوں میں اپنا اظہار کرتی ہے، اور عارف میں آ کر یہ "نظر" پیدا کرتی ہے۔ پیغمبر میں اسی تجلی کو وحی کہتے ہیں کیونکہ اس کے اشتداد میں قوت ہوتی ہے، وسعت ہوتی ہے اور اُس کی بنیادی صداقتوں میں ہمہ گیری اور کلیت۔ یہ صداقتیں کچھ ایسی معقول صورت میں نمایاں ہوتی ہیں کہ انسان کا ذہن ان کا فوراً اقرار کر لیتا ہے۔ ایسی صداقتوں کی ایک مثال حق تعالیٰ کی وحدت اور قدرت ہے اس کے اقرار سے قلب میں یہ یقین ضروری طور پر پیدا ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کا ہر فعل صائب ہے اور اگر اس کے احکام پر صدق دل سے عمل کیا جائے تو ہمیں دنیا اور آخرت دونوں میں ہدایت نصیب ہوگی، اور ہمارے لئے سب سے بہتر راستہ یہ ہے کہ سرِ تسلیم و رضا خم کر دیں اور اس کے احکام کی پیروی کریں جو ہمیں شر و اضلال سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اخلاقی ذمہ داری کے احساس کی تحت عمل کرنا "بِرّ" یا تقویٰ کہلاتا ہے۔ یہ ہے اسلام کی تعلیم، اور یہ دنیا میں ایک ذاتِ بابرکات کے توسّط سے آئی جس کو اسی وجہ سے دُنیا پیغمبرِ اسلام کہتی ہے۔ خود ان پر اس کا فیضان، وحی، کے ذریعہ ہوا جس کی حقیقت اوپر بیان کی گئی۔

اسلام: | دنیا کے دو سرے بڑے مذاہب پر اسلام دو خاص وجوہ سے تفوق رکھتا ہے: ایک یہ کہ اس کا ظہور تاریخ کی پوری روشنی میں ہوا، دوسرے یہ کہ وہ دنیا کو ایک ناقابلِ تحریف نوشتہ کی صورت میں دیا گیا۔ مشکل ہی سے کوئی دوسرا مذہب ان دو امور میں اتنی وضاحت کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں کسی قسم کا ستر و غموض نہیں، اور اسی وجہ سے وہ روایتی اخفا و رازداری کے پُر فریب عمل کا شکار نہ بنا۔

حق تعالیٰ کے خاص فضل نے اسلام کی نگہبانی کی، اس کا انکشاف ایک خاص عقلی معنی میں وحی کے ذریعہ ایک ایسی ذات پر ہوا جو نہ محض خیالی و فرضی تھی اور نہ الوہیت سے متصف۔ اس طرح یہ دنیا کو عطا کیا گیا۔ دو عظیم الشان سلطنتوں کے ڈانڈے اس کے جنم بھوم سے مل رہے تھے۔ ان دونوں سے اس کو بہت جلد دست و گریبان ہونا پڑا۔ ان دونوں پر یہ غالب آیا اور ان میں سے ایک کو تو بالکل اپنے اندر جذب کر لیا۔ قدیم سلطنتوں کو اس نے محض اسلحہ کے ذریعہ مسخر نہیں کیا بلکہ اپنے جدید تمدن کی قوتِ حیات کے ذریعہ۔ اس میں نہ کوئی ستر ہے نہ غموض، واضح اور اُجاگر تاریخی واقعہ کے طور پر ہماری نظروں کے آگے موجود ہے۔ اور نہ اس کے عقائد میں کوئی ستریت کا عنصر شامل ہے۔ کیونکہ ان کی بنیاد تین سادہ اساسی تیقّنات پر ہے جن کی تائید عقل سے ہوتی ہے:-

(۱) موجوداتِ عالم کے ایک ہمہ تواں خالق و مدبر ذات کی ناقابل شک برتری۔

(۲) اس کا ایک منتخب رسول کے ذریعہ وحی کی صورت میں بنیادی صداقتوں کا انسان تک پہونچانا۔

(۳) ایک قابل فہم پیام جس کی عقلی طور پر توجیہہ کی گئی ہے اور جو انسان کی موجودہ و آئندہ زندگی کی روحانی و اخلاقی ہدایت کے لئے بھیجا گیا ہے۔

یہ مذہب کا وہ سادہ تصور ہے جس میں کوئی ستریت پیدا نہیں کی جا سکتی۔ یہ ایمان کو ہر شخص

کے لئے قابل حصول بناتا ہے اور عقل اس کی تائید کرتی ہے۔

(۱) خدا واحد ہے، قادر مطلق ہے رحمان و رحیم ہے۔ مُلحد و مُشرک بنے بغیر کون شخص اِس سے اختلاف کر سکتا ہے؟

(۲) وہ رُسول اور ہادی مقرر کرتا ہے تاکہ انسان کو صراط مستقیم کی طرف ہدایت کرے۔ تمام پیمبروں، ہادیوں اور مصلحوں کے وجود کا انکار کئے بغیر (جو تمام مذاہب میں تسلیم کئے جاتے ہیں) کون شخص اس صداقت سے انکار کر سکتا ہے؟

(۳) وہ انسان کی اخلاقی و روحانی ہدایت کے لئے ایک قابل فہم پیام بھیجتا ہے۔ اخلاق و مذہب کو ایک دوسرے سے جُدا اور مذہب کو معطّل کئے بغیر کون اس پر اعتراض کرنے کی جرأت کر سکتا ہے؟

جو شخص ان صداقتوں کو تسلیم کرتا ہے اس کو اس دعویٰ کی قوت پر ہرگز شبہ نہیں ہو سکتا جو اسلام کی جانب سے ان ہی عام اصول کی بنا پر پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ قابل تصور ہے کہ اگر یہ شخص مسلمان نہ ہو تو یہ سوال اس کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا پیغمبر اسلام حقیقی پیغمبر بھی تھے جن کو خدا نے رسول بنا کر بھیجا تھا؟ اس سوال کا جواب دینا اس امر کے تعین پر منحصر ہے کہ "حقیقی پیغمبر" کے متعلق ہمارا تصور کیا ہے، وہ کن اوصاف سے متصف ہوتا ہے، اس کا ظہور کس طرح ہوتا ہے اور وہ اپنی رسالت کو کس طرح بجا لاتا ہے، بنی نوع انسان کے سامنے کس قسم کا پیام پیش کرتا ہے اور اس کے نہج عمل کا مبدء کیا ہے؟

معجزہ بذاتہٖ نبوّت نہیں: اگر ہم حقیقی نبوت کی ایک اہم شرط کے طور پر ما فوق فطرت اور عجیب و غریب چیزوں کی تلاش کریں تو جس قدر کوئی واقعہ ماورا فطرت ہو گا اسی قدر وہ پیغمبر کے پیام و منزلت کا بیّن ثبوت ہو گا۔ مثال کے طور پر معجزات کی قابلیت کو لو۔ اگر ہم اس کو نبوت کا واحد معیار قرار

دیں تو بہت سارے نبی نبی نہ رہیں گے کیونکہ ان سے کسی معجزہ کا صدور ثابت نہیں۔

معجزوں پر ایمان انسانی ذہن کا ایک انوکھا واقعہ ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے کسی قدر تناقض بالذات معلوم ہوتا ہے۔ گو ہم عام طور پر غیر فطری واقعات پر اعتقاد نہیں رکھتے تاہم بعض دفعہ قوت کے قابلِ قبول ثبوت کے طور پر ناقابلِ یقین شے ہی کے اظہار کا مطالبہ کرتے ہیں! شعوری یا غیر شعوری طور پر ہماری حجت یہ ہوتی ہے کہ معمولی طور پر تو انسان سے ایسے افعال کا صدور نہیں ہو سکتا، اب جس شخص سے ان افعال کا صدور ہوتا ہے وہ یقیناً فوق البشر ہستی ہوگا۔ اور چونکہ ان افعال کے صدور پر ہم فوراً یقین کر لیتے ہیں لہذا کسی مزید شہادت کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ ظاہر ہے جہاں خدا کی قدرتِ مطلقہ کا تعلق ہو وہاں کسی قسم کے عجز کو کیا دخل، اور معجزات کی قوت بھی براہ راست خدا ہی کی طاقت کا مظاہرہ ہے۔ یہ ہے استدلال ایمان والوں کا اور کوئی ان سے مناقشہ کرنے کا حق نہیں رکھتا۔

اب اس شخص کی مثال پر غور کرو جس سے معجزات کا صدور نہیں ہوا یا ان کا ہونا ثابت نہیں یا ان پر کسی کا یقین نہیں۔ اگر ایسا شخص کسی باطنی تہیج یا القا کی وجہ سے عظیم الشان صداقتیں فطری طریقہ پر بنی نوع انسان تک پہونچاتا ہو تو کیا کوئی ذی فہم اس کی بات پر اتنا ہی یقین نہ کرے گا جتنا کہ اس شخص کی بات پر جس سے معجزات کا صدور ہوا ہے؟ کیا یہ مناسب ہوگا کہ جو قوتِ مطلقہ یہاں پسِ پردہ عمل کر رہی ہے اس کو تسلیم نہ کیا جائے؟

کسوٹی | نبوت کی ایک اور قسم ہوتی ہے جس میں معجزہ اور عقل دونوں کا امتزاج ہوتا ہے جس کا مبدء ایک غیر معمولی فعال قوت ہوتی ہے، لیکن یہ کسی ماورا انسان رتبہ یا طریقہ عمل کا دعویٰ نہیں کرتی۔ یہی حال ذی شان پیغمبر اسلام کی نبوت کا ہے۔ گو ان پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی ایک فرشتہ کے ذریعہ نازل ہوتی ہے تاہم ہر لحاظ سے ان کا عمل اور ہر موقع پر ان کا کلام ایک انسان ہی کا

جیسا ہوتا ہے۔ سوائے اس پیام کے جس کو بنی نوع انسان تک پہونچانے کا انھیں حکم ملا دہ کسی افتبار الہٰی کو اپنی ذات کی طرف منسوب نہیں کرتے تھے۔ ان کا یہ انکسارِ نفس ذی عقل افراد کے قلوب پر گہرا اثر کرتا ہے اور فرشتہ کی مداخلت ایمان کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔ کیونکہ مدعیان عقلیت تک ارواح و ملائک کے وجود کا قطعی انکار کرنے میں شاید پس و پیش کریں گے۔ وہ یہی کہہ سکیں گے، اور ان کا اتنا کہنا صحیح ہوگا کہ نہ خود اُنھوں نے نہ اُن کے کسی دوست و آشنا نے کبھی کسی روح یا فرشتہ کو دیکھا ہے۔ لیکن ان کی یہ حجت زیادہ مفید نہیں، کیونکہ حقیقی سوال تو یہ ہے کہ خود پیغمبر نے بھی انھیں دیکھا تھا یا نہیں، انھیں جو کچھ نظر آیا وہ حقیقی تھا یا نہیں۔ یہاں پر ہمیں، ذہنی اور خارجی، حقیقت پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں، یہ وہ الفاظ ہیں جو ہمیں اپنی جدلیات کے دائرہ سے باہر لے جاتے ہیں: تصوریہ، کے لئے ہر شئے غیر حقیقی ہوتی ہے اور حقیقیتیہ، کے لئے ہر شئے حقیقی لیکن اس سے قطع نظر، کیا ہمیں حکمت وارتیابیت کے اس جدید دور میں، خارقِ عادات مظاہر کی بہت ساری مصدقہ مثالیں نہیں ملتیں جن کی توثیق زمانۂ حال کے بعض مشہور و معروف علما رسائنس نے بھی کی ہے؛ ان ہی وجوہات کی بنا پر ہم میں سے بہت ساروں کے لئے فرشتہ کی مداخلت پر یقین رکھنا زیادہ آسان ہوگا بہ نسبت اس امر کے کہ ایک ایسے فعل کے صدور پر ایمان لایا جائے جو قوانینِ فطرت کے عمل ہی کو مسدود کر دیتا ہے یا ان میں کافی تغیر پیدا کر دیتا ہے۔ فرشتہ کے پیکرِ خیالی کے متعلق تشکک بھی یہ مان سکتا ہے کہ یہ اس "نامعلوم فعلیت کی محسوس صورت ہو سکتی ہے جو القارِ قلبی میں شدت پیدا کرتی ہے اور اس کو وحی کے مرتبہ تک پہنچاتی ہے۔ ہم میں سے بہتوں کے لئے یہ تصفیہ قابل فہم ہے اور اگر اس کو اسی طرح سمجھا جائے تو یہ اس فطری احتمال کے خلاف بھی نہیں پڑتا جس کا ہم سب لحاظ رکھتے ہیں۔ اس واسطۂ رسالت کو ہم فرشتہ کہیں یا القارِ قلبی یا وحی، واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک شعوری کیفیت" ہے جو اپنی فعلیت کے لحاظ سے نہایت شدید اور حقیقت پسندانہ ہوتی ہے

جو شخص اس کے زیر اثر ہوتا ہے، اگر وہ دنیا کے سامنے سوائے وہمیات و التباسات کے کوئی حقیقی اور مفید شئے پیش نہ کرے تو جائز طور پر وہ تخیل پرست سمجھا جائے گا؛ لیکن اگر اس کے برخلاف وہ دنیا کے آگے ایک سادہ اور قابلِ فہم عقیدہ اور عملی اخلاق کا اتنا ہی سادہ ضابطہ پیش کرتا ہے، اور ایمان اور عملِ صالح میں پائیدار اور ناقابلِ تحلیل رشتہ قائم کرنے میں کامیاب ہوتا ہے تو ایسا آدمی برترین مرتبہ پر فائز ہوگا اور بنی نوعِ انسان کا مصلح و محسن سمجھا جائے گا۔ بحیثیت پیغمبر وہ ایک غیر معمولی بلندی پر پہونچتا ہے۔ کیا یہاں کوئی بات تمہیں خلافِ عقل معلوم ہوتی ہے۔

یورپی افکار میں ہمیں ذہنِ انسانی کی ایک غیر معمولی قوت کا تصور ملتا ہے جس کو "جی نی ئیس" (عبقریت) کہا جاتا ہے، یہ ایک غیر معمولی وقوف ہے جس کی نفسیاتی تحلیل ممکن نہیں۔ یہ بعض آدمیوں میں پایا جاتا ہے اور اس کی شناخت ان کے کارناموں کی نوعیت و کیفیت سے کی جاتی ہے۔ اگر ذہن کی اس کیفی حالت کا وجود تسلیم کر لیا جائے تو کیا پھر کوئی معقول وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ وقوف کی ایک زیادہ شدید صورت کا انکار کر دیا جائے جس کو وحی کے مناسب نام سے یاد کیا جاتا ہے؟

قرآن کریم کا بامعانِ نظر مطالعہ کرنے والا یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جس وحی پر محمد صلعم کی نبوت کا دار و مدار ہے وہ اس وقوف کے سوا کچھ نہیں جس کو حق تعالیٰ کے علمِ ازلی نے انھیں بنی نوعِ انسان کو ظلمت سے نور کی طرف ہدایت کرنے کے لئے عطا فرمایا تھا۔ انہیں بار، بار یہ یاد دلایا جاتا ہے کہ وہ محض ایک بشر ہیں، مُنذر ہیں، قرآن کے محافظ نہیں۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس امر پر اصرار فرماتے ہیں کہ میں بھی تمہاری طرح آدمی ہوں، فرق اتنا ہے کہ میں رہنمائی حق کے تحت عمل کرتا ہوں اور تمہارے لئے ایک ہمہ گیر پیام لایا ہوں۔ ان کا پیام سارا قرآن ہے، یہ اُن کے اقتدار کی سند ہے اور اس میں، جیسا کہ اُن کے ہم عصروں اور بعد میں آنے والی نسلوں نے سمجھا، ہی اعجزے سے بھی زیادہ اہم، جامع، اور عمل کے لحاظ سے ہمہ گیر امور درج ہیں۔

عقلیت کے اس مسلک کا اتباع کرتے ہوئے ہم اس تصور سے کوسوں دور ہو جاتے ہیں کہ کسی انوکھی، عجیب و غریب، پُر اسرار اور غیر فطری شے کے ظہور کو نبوت کا صحیح معیار قرار دیا جا سکتا ہے اور جہاں تک ممکن ہو سکے اس سے دور ہونا ضروری بھی ہے تاکہ ہم اسلام کو صحیح طور پر سمجھ سکیں اور عقلی مذہب ہونے کی وجہ سے اس میں جو خوبیاں پائی جاتی ہیں اس کی بخوبی قدر کر سکیں۔

میں نے ایمان کی دو مختلف راہیں اور اس کے دو متضاد اصول، فطری و غیر فطری، کسی قدر اجمال کے ساتھ پیش کر دئے ہیں۔ اگر ہم ان میں سے کسی ایک پر یقین کریں تو لازمی طور پر اس کے مناقض اصول پر ہمارا ایمان نہ ہوگا۔ میں نے اس راہ کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے جو ان ضدین کے کے درمیان سے گزرتی ہے اور جس کی اتباع زیادہ صلح پسند طبائع کر سکتی ہیں۔ ایسی طبائع خارق عادات اور عجیب و غریب چیزوں کو بھی قدرتِ مطلقہ کے مظاہر قرار دے کر قابلِ فہم ایمان کے حصول کی کوشش میں واقعات کے قابلِ فہم تسلسل کا زیادہ تر اتباع کرینگی۔

محض خارقِ عادات اور عجیب و غریب چیزیں نہ وہ معیار قرار دی جا سکتی ہیں اور نہ دی جانی چاہئیں جن سے محمد صلعم کی نبوت کی حقیقت اور ان کے پیام کی صداقت کو جانچا جا سکے۔ قوتِ الہٰی کے وہ مظاہر جو حضرت موسیٰؑ و حضرت عیسیٰؑ کو عطا کئے گئے تھے اسلام کی ثقاہت و صداقت کے ثبوت کے لئے ضروری نہیں سمجھے جانے چاہئے۔ کیونکہ پہلے تو تاریخی طور پر ان کے متعلق بہت کم معلومات حاصل ہیں، اور دوسرے، اسلام کی ابتدا کی توجیہہ خود قرآن میں ہماری سمجھ کے لئے عقلی طور پر کی گئی ہو؛ اس امر کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ قرآن کا انکشاف ہی انسانی ذہن کے لئے ایک ایسے انسان کے ذہن کے واسطے سے ہوا ہے جس نے اس کو اعلیٰ و قابلِ فہم صداقتوں کے ارتقا کے طور پر حاصل کیا تھا۔

پیام الہٰی کا جو شخص ظرف بن رہا ہے اس کے لئے فرشتہ کی موجودگی ویسی ہی خارجی حقیقت رکھتی ہے جیسی کہ سقراط کے لئے اُس کا ضمیر؛ زمانہ جدید کے عقلیت پسند ذہن کے لئے یہ آگہی کا ایک ذریعہ ہے جو

محض فکر سے زیادہ حقیقی اوران حواس کے لئے زیادہ اُجاگر ہوتا ہے جو اس کی حقیقت سے متاثر ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا یہ عین اقتضائے فطرت ہے کہ جو فرشتہ اس شخص کو نظر آئے جو ملہم من اللہ ہو ان لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رہے جو مُلہَم مِنَ اللہ نہیں۔

تینوں سامی مذاہب ملائکہ کے وجود، ان کے اسمار اور افعال وغیرہ کی تعلیم دیتے ہیں۔ یہودیوں، نصرانیوں اور مُسلمانوں، سبھوں کو یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ حق تعالیٰ کے پیغام پہونچانیوالے ہیں

ظہورِ حق: ذاتِ نامتناہی کے معاملہ میں عہدِ قدیم کے فلسفیوں کی آوارہ گردیوں کا ذکر مسٹر روسنے اپنے مضمون "حقیقت آلہہ" میں اختصار لیکن صراحت کے ساتھ کیا ہے۔ یہاں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ فلاسفہ کی تحقیق وتدقیق سے قطع نظر اہلِ یونان اور اہل روما کے ذہن میں وجود باری کے متعلق ایک مبہم سا یقین ضرور پایا جاتا تھا، اور اسی چیز کو بعض فلسفیوں نے آلہہ کے یا دیوتاؤں کے وجود کے ثبوت کی قوی ترین حجت قرار دیا ہے۔ "تعلیم رواج، یا قانون کو الگ کرکے بھی بنی نوع انسان کی ہمیشہ کلی طور پر یہ رائے رہی ہے کہ دیوتاؤں کا وجود پایا جاتا ہے، اس سے ضروری طور پر لازم آتا ہے کہ یہ علم ہم میں وہبی ہے۔ جس رائے کی تائید فطرت کی ایک کلی برہان سے ہوتی ہو وہ قطعی طور پر درست ہوگی؛ لہٰذا یہ ماننا پڑتا ہے کہ دیوتا وجود رکھتے ہیں" ہمیں معلوم ہے کہ کس طرح سامی ذہن میں اس قسم کے استنباطی یقین کا سارا ابہام اور تذبذب رفع ہوگیا اور ایک پُرجوش ایمان نے اس کی جگہ لے لی، اور انبیا میں تو اس نے اس تہیج کی شکل اختیار کرلی جس کا مبدء خود خدا تھا اور جس کا اعلان ساری دنیا کے آگے کیا گیا۔ یہی معنی ہیں اس القائے قلبی کے جو اپنی بے پناہ قوت اور نور بخش خاصیت کی وجہ سے وحی کہلاتا ہے۔

تمام مذاہب میں حق تعالیٰ کی وحدت: وہ تمام مذاہب جو مُلہَم مِنَ اللہ ہیں اور جن کا ہمیں علم ہے حق تعالیٰ کی وحدت، اس کی قدرتِ مطلقہ، اس کے کرم، اس کے عدل ورحم پر یقین رکھتے ہیں، اور انسان کو

عقیدہ اور عمل میں صالح بننے کی ہدایت کرتے ہیں۔ یہاں تک تو اُن کی تعلیم میں کوئی بنیادی فرق نہیں اور کہا جا سکتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا اور اس کے احکام کے متعلق بالکل وہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ لہذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جن مذاہب کا ان پر نزول ہوا وہ بالکل ایک ہیں؛ اور یہی وہ صداقت ہے جس پر قرآن اصرار کرتا ہے۔ وہ حکم دیتا ہے کہ خدائے واحد پر ایمان لاؤ اور صراطِ مستقیم کو اختیار کرو جو تمہیں اس تک پہونچاتا ہے۔ صراطِ مستقیم کیا ہے؟ اولاً خدا کو مولا و ہادی مان کر اس کی مشیت اور ارادہ کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا، پھر اُس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا اور پھر اس کے قرب و معیت کے حاصل کرنے کے لئے عملِ صالح کا اختیار کرنا۔ کیا ان تمام شرائط کو روحِ انسانی کا وہ ملکہ جس کو ضمیر کا لقب دیا گیا ہے قبول نہیں کرتا؟ گو یہ مذہبی احکام کے طور پر ہم تک پہونچائے جاتے ہیں لیکن یہ ہماری ذات سے خارج نہیں، یہی وہ اساسِ مشترک ہیں جہاں مذہب و فلسفہ اور ہماری فطرت اور اس کی عمیق تمناؤں کا ربط و اتصال واقع ہوتا ہے۔ قرآن دوسرے الہامات کی طرح اسی ربط و اتصال کو قائم کرتا اور اسکو قوی کرتا ہے۔

قرآن قابلِ فہم پیام ہے: | قرآن کے مطالعہ کے وقت یہ یاد رکھنا اچھا ہوگا کہ اگر خدائے انسان سے مکالمہ کیا تو یہ مکالمہ انسان ہی کی زبان میں ہوا ہوگا تا کہ اس کی سمجھ میں آئے، اور جو تصورات و تعقلات خدائے اپنے پیام میں استعمال کئے ان کو انسان کی فہم کے مطابق بنانا پڑا ہوگا، اور جن تشبیہات و استعارات سے کام لیا گیا وہ ضرور ایسے ہوں گے جو انسانی عقل کو متاثر کر سکیں روحِ انسانی پر، جو خدا کے پیام کی حامل ہوتی ہے، وہ بوجھ نہیں ڈالا جاتا جس کے اُٹھانے کی وہ طاقت نہیں رکھتی اور اس کو وہ پیام نہیں بھیجا جاتا جس کو وہ سمجھ نہیں سکتی، کیونکہ ایسا کرنا تو صریح ظلم ہوگا اور خدا میں ظلم کا شائبہ نہیں۔ " وما انا بظلّام للعبید"۔ لہذا کیا ہمارا یہ استنتاج درست نہیں کہ منشار الہیٰ کے یہ صریحاً خلاف ہے کہ انسان کو ایسی زبان میں سرمدی صداقتوں

سے باخبر کیا جائے جو اس کی سمجھ سے باہر ہو یا محض ایسے تجریدات یا قضایا میں بات کی جائے جس کو مابعد الطبیعات کے پروفیسر ہی کا ماہر دماغ سمجھ سکتا ہو۔ یہ تو ہم آسانی قیاس کر سکتے ہیں کہ قادر مطلق فلاطون جیسے شخص کو غامض فلسفیانہ بیانات بھیجتا ہے اور ملٹن جیسے شخص کو دینیات کے عمیق مسائل کا وقوف بخشتا ہے، لیکن یہ کسی طرح نہیں مانا جا سکتا کہ یہی طریقہ وہ اس وقت بھی اختیار کرتا ہے جب اس کے مخاطب امی لوگ ہوتے ہیں جن کو وہ صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کرنا چاہتا ہے۔

قرآن کی معقولیت: ان امور کو مدنظر رکھ کر ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ غیر متعصب ذہنوں کو متاثر کرنے میں قرآن کی یقین بخش قوت کا راز اس کی معقولیت ہی ہے، کیونکہ ایمان یا جبری خوش اعتقادی سے قطع نظر، عقلیت پسند ذہن اور صداقت میں ایک قسم کا جبلی تطابق پایا جاتا ہے اس طرح دوسرے عقیدہ کے لوگ بھی جو قرآن کا مطالعہ اس نقطہ نظر سے کرتے ہیں کہ وہ ایک انسانی کتاب ہے جس کو ایک مخلص اور بلند مرتبت ذہن نے عروج کے ایک غیر معمولی جذبہ کے تحت لکھا ہے، عقلی اسباب کی بنا پر اس کی خوبیوں کی قدر کر سکتے ہیں۔

یہ بات ہرگز فراموش نہ کرنی چاہئے کہ یہ وحی دنیا کے آگے ایک انسانی ذہن کے توسط سے ایک ایسی زبان میں پیش کی گئی جس کو انسان آسانی سے سمجھ سکتا ہے اور اتنی ہی آسانی کے ساتھ اپنی ضروریات کے لئے اس کا استعمال کر سکتا ہے۔ وہ مرکزی اصول جس پر یہ زور دیتی ہے خالق کائنات کی وحدت مطلقہ ہے، یہ وہ اصول ہے جس کو زمانہ دراز سے فلسفہ اور عقل نے تسلیم کر لیا ہے۔ اسی اصول کی بنا پر وہ خالق اور مخلوق کے ربط کی توضیح کرتی ہے۔ مطالبہ کرتی ہے کہ انسان اس ربط کا اعتراف کرے، اپنے خالق کی عبادت کرے، اور اپنے اعمال کو تقوی کے بلند ترین معیار کے مطابق بنائے؛ صرف اسی طرح وہ نسبتِ الہی کے اہم شرائط کی تکمیل

کرسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مطالبہ میں عقل کے سوا کسی اور قسم کا جبر نہیں، کوئی سرِ غموض نہیں، کوئی کٹھن یا پیچیدہ نظریہ نہیں، اور نہ ہی ایمان کی کوئی بیجا کوشش۔ ایمان کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ ایک ہمہ تواں، ہمہ داں، ہمہ بیں قیوّم طاقت کے اعلیٰ اقتدار کو تسلیم کرے۔ یہاں ایمان کی تائید عقل سے بھی ہوتی ہے، کیونکہ تمام مخلوقات کا ربطِ باہمی، (خواہ نظام کلی میں انکی صورتیں اور ان کا مقام کچھ ہو، اور اس مرکزی تخلیقی قوت یا ارادہ سے، جو ان کا ماخذ و منبع ہے، خواہ وہ کچھ ہی تعلق رکھتے ہوں) سائنس کے لئے بھی ویسا ہی ایک اصولِ موضوعہ ہے جیسا کہ ایمان کے لئے ایک عقیدہ۔ سائنس (حکمت) جو فطرت کی تحلیل آہستہ اور جپا کشانہ طریقہ سے کرتی ہے صداقتِ کلی کے علیحدہ علیحدہ اجزا کو یکے بعد دیگرے حاصل کرتی ہے، اس کے برخلاف ایمان اپنے باطنی نور کی وجہ سے اس سے فوراً باخبر ہو جاتا ہے اور اس تک ایک جست میں جا پہونچتا ہے۔ جب وحی کے مسئلہ پر اس حیثیت سے غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام الہامات جو پُرجوش اور مخلص افراد کو عطا ہوتے سب کے سب واقعۃً صحیح ہیں اور جو نظریہ کہ اُن کو سوچا سمجھا ہوا جعل یا فریب قرار دیتا ہے وہ یا تو جہل کا نتیجہ ہے یا متعصب ذہنوں کے خبثِ باطن کا۔ رواداری قلوب ہی کو حق حق نظر آتا ہے، اور جو قلوب رواداری کی صفت سے عاری ہوتے ہیں وہ اپنی ہی باطل آرار کو صداقت خیال کرتے ہیں۔ قرآن ان تمام الہامات کو تسلیم کرتا ہے جو پیغمبر اسلام سے قبل عطا ہوئے اور ان پر یقین کرنے کا حکم دیتا ہے۔ جن لوگوں نے الہامات کو تسلیم کیا لیکن اوامرِ الٰہی کی نافرمانی کی، اُن پر وہ ملامت کرتا ہے، اور صاف طور پر بتلاتا ہے کہ انھیں سزا اس لئے نہیں ملیگی کہ وہ دوسرے مذہب کے پیرو تھے بلکہ اسلئے کہ انھوں نے کُتُبِ الٰہیہ میں تحریف کی اور اس کے معنیٰ بدلدیئے جہاں الٰہی مذاہب کے اصول، صدیوں کے دوران میں ادعای دینیات کے نظریہ کے نیچے دب گئے ہیں (جیسا کہ تاریخ شاہد ہے) اس الزام کی آسانی سے تردید نہیں کی جاسکتی۔

باب چہارم

قرآن کا دائرہ عمل

قرآن کی اخلاقیات: زمانۂ جدید کے انسان کے لئے قرآن میں کوئی چیز اتنی نمایاں اور جاذبِ توجہ نہیں جتنا کہ عمل صالح پر اس کا اصرار۔ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان اور عملِ صالح، یہ اسلام کا بنیادی اصول ہے۔ جو لوگ اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں وہ نجات کے مستحق ہیں قرآن میں مختلف عبارتوں میں اس چیز کو واضح کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں "کسب" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس طرح قرآن کے اوامر و نواہی اور توجیہات کو یک جا جمع کرنے سے ہمیں "تقوی" کا علم حاصل ہوتا ہے جو ایمان کے نقطۂ نظر سے نہایت اہم شے ہے۔

اخلاق کے اُس معیار پر غور کرتے وقت جو قرآن کریم میں دیا گیا ہے ہم اپنے ذہن کو اس قسم کے سوالات سے خالی کر سکتے ہیں جیسے تعددِ ازدواج وغیرہ کیونکہ اصل میں یہ اخلاقی سوال ہی نہیں۔ یہ حکم کہ ہمیں اپنے جذبات پر ضبط رکھنا چاہئے اخلاقیات کے دائرہ سے تعلق رکھتا ہے، اور قرآن میں دراصل وہی ہے جو اس مقولہ سے ادا کیا گیا ہے: "نیکی وسط میں پائی جاتی ہے"۔ قرآن ان تمام افراط و تفریط کو بُرا سمجھتا ہے جو گناہ کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ ان اصول میں سے ایک ہے جن پر وہ زور دیتا ہے۔

علاوہ ان منتشر عبارتوں کے جو اخلاق سے تعلق رکھتی ہیں قرآن کی بعض سورتوں میں ان صفات کی بھی کافی جامع فہرست ملتی ہے جن سے اسلامی "تقوی" کی تشکیل ہوتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ انکو مناسب ترتیب کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کردوں تاکہ وہ قرآن کی اخلاقی تعلیم کا صحیح تصور قائم کر سکیں۔

ہم دیکھیں گے کہ اخلاقی نوعیت کے کتنے اوامر و احکام ہیں جو قرآن کریم میں ملتے ہیں اور جنھیں ہمارے اخلاق کا ضابطہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ صفائیِ قلب، صداقت، قناعت، شکر، صبر، اخلاص، عدل و رحم، جود و کرم، امانت و استقامت، والدین اور اولی الامر کی اطاعت، ہمدردی و بے غرضی، رفق و مروت و محبت، اور سب سے زیادہ عفت و اعتدال جو ان صفات کو فعال اور موثر بنائیں دوسرے مذاہب کے پیرو خواہ وہ قرآن کو ملہم من اللہ سمجھیں یا نہ سمجھیں، اس امر کا تو انہیں اعتراف کرنا پڑیگا کہ یہ ضابطہ، بہ نسبت کسی دوسرے قدیم ضابطہ کے، جو ہم تک پہونچا ہے، انسانی کردار کی ہدایت اور ضمیر کی رہنمائی کے لئے زیادہ کامل، زیادہ واضح، اجاگر اور موثر ہے۔ عہدِ عتیق کے کسی مقنن نے (خواہ سولن ہو یا لائی سرگس) اس کا آدھا بھی تو نہیں دیا، اور نہ افلاطون وارسطو ہی نے کردارِ حیات کے اس سے زیادہ واضح قوانین تجویز کئے۔ ان اوامر میں سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ یہ ہم میں ایسی روح پھونکتے ہیں جو ہمارے قلب کو گرمانے میں بجلی کا کام کرتی ہے۔ ان میں ایک دبا ہوا جوش ہے وہ سادہ الفاظ کے ہی ذریعہ روح کو تلملا دیتا ہے۔ اس نے ساتویں صدی مسیحی میں بادیۂ عرب کے سادہ دل بدوی کے قلب پر عجیب وغریب اثر کیا، اسکی رگوں میں بجلی کی سی لہر دوڑادی اور اس کی ہیئت ہی بدل دی! یا تو وہ ایک ناپاک جانور تھا جو اپنی نجاست اور گندگی میں مست تھا یا وہ دفعۃً چونکتا ہے اور ایک ہی زندگی کے دوران میں طاہر و مطہر انسانیت کی بلند ترین چوٹیوں تک جا پہونچتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ وہ دوسری اقوام پر حکومت کرنے کے لئے بنا ہے۔ فیا للعجب! یہ ہے پیغمبر اسلام کا زبردست معجزہ!

قوم سازی: اب ہم قوم سازی کے متعلق بحث کرتے ہیں۔ ذرا غور کرو کہ ساتویں صدی میں دشتِ عرب کے وحشیوں کو ایک ادھیڑ عمر انسان نے، جس کی روح نے قرآن سے فیضان حاصل کیا تھا پچیس سال سے کم عرصہ میں کس طرح ایک قوم، بنا دیا!

قرآن نے اس کی رہبری کی اور اس نے اپنی قوم میں شعورِ اخلاقی کے ذریعہ ذمہ داری کا وہ قوی احساس پیدا کر دیا جو انسان کو اس کے خدا، خالق دو عالم سے وابستہ رکھتا ہو۔ اور اس ذمہ داری میں یہ فرض شامل تھا کہ خدا کے پیام کو زمین کے بعید ترین گوشہ تک پہونچا دیا جاتے۔ اور اس پیام کی کامیابی میں جو موانع حارج تھے ان کے رفع کرنے کی کوشش بھی اسی میں بطور نتیجہ شامل تھی۔ قرآن کی ان آیات کا بغور مطالعہ جن میں غزوات کا ذکر کیا گیا ہے، ہمیں یہ یقین دلاتا ہو کہ عربوں کو ان سے زیادہ قوی اقوام سے مقابلہ کرنے کے لئے اس لئے نہیں اُبھارا جاتا تھا کہ محض فتوحات کی خاطر ممالک فتح کئے جائیں، بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ تھی کہ اسلام کی دعوت کو عام کیا جائے جو سارے عالم کا فطری دین ہے۔ بعض آیتیں ایسی ہیں جو اس خیال کی تائید کرتی ہیں، اور بعض ایسی ہیں جو میرے نزدیک دریچوں کے مانند ہیں جن سے تاریخ اسلام کا پھیلنے والا منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے جب میں ان پر تفکر کرتا ہوں تو میری بصیرت کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہو اور میں احد و بدر کے چھوٹے غزوات سے نکل کر عراق و ایران، مصر و اندلس کے عظیم الشان قومی معرکوں میں جا پہونچتا ہوں جو محض صداقت کی اشاعت کے لئے لڑے گئے۔

قرآن حکمت ہے: قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ حکمت ہے، لیکن وہ اخلاقیات یا مابعد الطبیعیات پر کوئی رسالہ نہیں۔ وہ اپنے حق ہونے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن وہ حق یا صداقت پر مقالہ نہیں۔ وہ اخلاقیات کے لب لباب کو مختصر اور جامع جملوں میں پیش کرتا ہے جو اس کے صفحات پر موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔

اگر قرآن کو مغربی معیار سے جانچا جائے تو ممکن ہے کہ وہ ایک صنعت کارانہ، مرتب تحریر نہ معلوم ہو، لیکن ہمیں یہ فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ اس کا یہ دعویٰ بھی نہیں جیسا کہ ہم نے گزشتہ باب میں تبلایا ہے، وہ پیامات، ہدایات یا احکام الٰہی کا ایک سلسلہ ہے جو ایک ایسے پُرجوش ذہن سے صادر ہوتے ہیں جس پر کامل طور پر خدا کا اثر و تسلط ہے۔ جس ذہن پر کہ ان کا القا ہوا اور جو زبان کہ ان کی گویا ہوئی، دونوں محض ایک منفعل آلہ کی سی کیفیت رکھتے تھے۔ جو قوت کہ ان کا مبدء تھی کچھ ایسی ناقابل مدافعت تھی کہ جب تک یہ رہی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا حامل صرع کے دورہ میں مبتلا ہے۔ بہرحال یہ تھا طریقہ اور یہ تھیں اس کی تدبیریں، اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا ہمیں اُن سے صداقت، خیر اور تقویٰ حاصل ہوتا ہے جو انسان کی زندگی کا منشا و مقصود ہے یا محض کذب و عدم تعین۔

قرآن میں حکمت کا لفظ ایک ایسے وصف کے طور پر استعمال ہوا ہے جو اس کی تعلیمات کے مفہوم کو ظاہر کرتا ہے۔ قرآن فلسفہ کا لب لباب پیش کرتا ہے اور اس میں زندگی کا سا جوش پیدا کر دیتا ہے۔ یہ فلسفہ مابعد الطبیعیاتی خیال آرائی کے دائرہ سے ماوراء ہے اور روحانی تیقین رکھتا ہے، اس کی یافت میں وہ صداقت موجود ہے جس کی تلاش مابعد الطبیعیاتی نظامات صدیوں سے کر رہے ہیں اور اب بھی ظلمت میں مبتلا ہیں۔ وہ وجودِ مطلق تک پہونچنے کی بے سود کوشش نہیں کرتا بلکہ وہ خدا کو پاتا ہے اور خدا کو پانے کا راستہ بھی تبلاتا ہے۔ اس کا تبلایا ہوا یہ راستہ طبیعی فطرت سے ہو کر گزرتا ہے جو سائنس کا دائرہ ہے۔ وہ ہم سے کہتا ہے کہ ذرا ہم اپنی آنکھوں سے کام لیں اور دیکھیں اور سمجھیں کہ قوائے فطرت کس طرح عمل کرتی ہیں اور غور کریں کہ زمین اور آسمان اور ان کی درمیان کی چیزوں کو کون سی طاقت پیدا کر سکتی ہے۔ وہ ہمیں ان چیزوں پر بھی غور و فکر کرنے کا حکم دیتا ہے کہ ایک مدفون و مدہوش نطفہ سے انسان کس طرح بنایا گیا، موت و

حیات کی کیسی تخلیق ہوئی اور وہ کون سی قوت ہے جو حیات کو موت میں اور موت کو حیات میں بدل سکتی ہے۔ جہاں تک ظاہری علّیت کا تعلق ہے یہ تمام مسائل جائز طور پر سائنس کے دائرۂ تحقیق میں شامل ہیں، لیکن جب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ”ان کا خالق کون؟“ تو پھر سائنس بھی لاجواب ہو کر سکوت اختیار کر لیتی ہے۔ اس نقطہ پر آکر جہاں مابعد الطبیعیاتی فلسفہ راست جواب سے عاجز نظر آتا ہے قرآن مذہب کا نام لے کر جرارت کے ساتھ اعلان کرتا ہے کہ ” اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیٍٔ“ اور وہ علّت اولی یا ارادۂ کائنات، جیسے الفاظ کی آڑ میں نہیں چھپتا۔ وہ فلسفہ کے تجریدات میں رُوح پھونکتا ہے اور ان کی انتہا الوہیت میں پاتا ہے اور وجودِ مطلق کو شخصیت سے متصف کرتا ہے۔

خدا بندے پر اپنا اظہار اپنی مخلوقات کے ذریعہ کر رہا ہے، اس کے لئے اس امر کی احتیاج نہیں کہ شے کے ساتھ اپنی معیت کے ظاہر کرنے کے لئے اپنی ذات کی تحویل انسان یا انسان کی بنائی ہوئی مورتوں میں کرے۔ تعالی اللہ عن ذٰلک علوا کبیرا۔ قرآن انسان کو یہ چیز یاد دلاتا ہے، بُت پرستی کی بیخ کنی کرتا ہے، اور مذہبِ تشبیہ کی تنسیخ کرتا ہے۔

انسان کارگاہِ تخلیق میں: اس برترین معنی کے لحاظ سے وہ حکمت ہے، یعنی عقل و صداقت جو ایمان کے ساتھ ممزوج ہو گئی ہے۔ وہ زندہ فلسفہ ہے مردہ نہیں۔

اس دنیوی ماحول میں کیا ہماری حیثیت محض اضافی نہیں؟ شاید ہماری اضافیت درست ہو، ہم ان تمام چیزوں سے تعلق یا اضافت رکھتے ہیں جو زمانۂ ماضی میں گزریں، جو اب ہیں اور جو آیندہ ہوں گی! یہ ایک ایسا تصور ہے جو ہمارے قلوب کو مرعوب کرتا ہے اور ایسی صداقت جس سے کوئی گریز نہیں، ہم اس میں مقیّد نظر آتے ہیں۔

اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہماری روح کا تعلق ایک اندھی کائنات سے ہے جو اس کو ظلمتِ عدم کی طرف لے جا رہی ہے یا کہ وہ ایک عظیم الشان اور خوبصورت نظم کا ایک

متوافق اور خوبصورت حصہ ہے جو ابد تک زیادہ شاندار اور زیادہ حسین ہوتا جائیگا ؟ ہمارے لئے یہی بہتر ہوگا کہ ہم ثانی الذکر عقیدہ پر یقین کریں اور یہ اُمید رکھیں کہ جس طرح یہاں ہیں جمال کی ایک حسّی دنیا ملتی ہے جو ہمارے حواس کے تلذّذ کا باعث ہے اسی طرح وہاں بھی جمال کی ایک روحانی دنیا ہے جو ہماری مجرد روح کی پاک اشتہاآت کی تشفی کرتی ہے اگر ہمارے دینوی حواس، جو ہماری ذات کا ایک حصہ ہیں، چاہیں تو ممکن ہے کہ ہماری روح کے لئے جمال کے دو عالم کھل جائیں، جن میں سے ایک بظاہر حسّی ہو اور دوسرا محض روحانی۔ جنت کا تصور اس سے بہت زیادہ قریب ہے اور اس سلسلہ میں جو مسلمہ تشبیہات ہیں ان کی توجیہہ بھی اسی طرح ہوسکتی ہے۔

فطرت سے ہمارا راستہ خدا کی طرف جاتا ہے۔ اولاً جبلّت ثانیاً فکر، استخراجی عمل کے ذریعہ ہمیں یہ خبر دیتی ہیں کہ ایک حقیقت۔ ایک تخلیقی قوت ضرور ایسی موجود ہے جو کائنات کو ڈھال رہی ہے، اس پر قادر ہے، اور اس کے اعمال کی تنظیم کر رہی ہے۔ اس طرح ہم ایک خالق اور مقنن کے تصور کو حاصل کرتے ہیں۔ اور یہی وہ نقطہ ہے جہاں سائنس، جو مشاہدہ کا نیتجہ ہے اور ایمان، جو ایک فطری جبلت کی تکمیل ہے، آملتے ہیں اور مذہب کی شکل میں بروز کرتے ہیں۔

کچھ اسی قسم کے عمل کی طرف قرآن اشارہ کرتا ہے اور انسان کی توجہ ہمیشہ افعالِ الہٰی، اور ان کی محرکِ ذہن قوت کی طرح مبذول کرتا ہے۔ بہت ساری عبارتیں ایسی ملتی ہیں جن میں فطرت کے عمل کی مختلف حیثیتوں کی طرف رجوع کیا گیا ہے تاکہ اسی واحد مرکزی عقیدہ کی تائید و توثیق کی جائے کہ خالقِ کائنات واحد و برتر (وحدہٗ لاشریک لہٗ) ہے۔ وہ آسمان و زمین کا خالق ہے اور ان چیزوں کا بھی جو ان کے درمیان پائی جاتی ہیں۔ وہ تمام اشیاء پر قادر ہے، ان تمام کا وہی مبدء ہے اور وہی مرجع۔ وہ جب کسی شئے کو "کن" کہتا ہے تو وہ ہوجاتی ہے۔ وہ انسان کو منی کے ایک حقیر قطرہ سے پیدا کرتا ہے پھر اس کا گوشت، خون، ہڈی اور پٹھا بناتا ہے اور ان میں جان ڈال دیتا ہے

اور اس جان میں ایک اور جان جس کو روح کہتے ہیں جو بالآخر خارجی ڈھانچہ سے مستقل اور غیر محتاج ہوتی ہے۔ یہ روح عقل و طبع و ادراک سے موصوف ہوتی ہے اور جسم کی حرکات پر قابو رکھتی ہے۔ یہ خدا کی صفات و افعال سے اپنی نسبت کا ادراک رکھتی ہے اور اس میں ایک دائمی میلان پایا جاتا ہے جو اس کو اپنے خالق کی تلاش میں لگائے رکھتا ہے۔ انسان کے اسی میلان سے قرآن خطاب کرتا ہے اور جب انسان گمراہی میں مبتلا ہو کر اس کو دبا دیتا ہے تو قرآن اس کو کافر کہتا ہے اور اس کفر کو کذبِ محض قرار دے کر اس پر ملامت کرتا ہے۔

"أَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَأَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ
مَآءً فَأَنْبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا كَانَ لَكُمْ أَنْ
تُنْبِتُوْا شَجَرَهَا ۗ ءَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ۞ أَمَّنْ جَعَلَ
الْأَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ أَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ
بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ۗ ءَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۞
أَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ
خُلَفَآءَ الْأَرْضِ ۗ ءَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۚ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۞ أَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ
فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۗ
ءَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۚ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۞ أَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ
يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ ۗ ءَإِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۚ
قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۞ (پ ۲۰ ع ۱)

یہ سب عقل کے عین مطابق معلوم ہوتا ہے، اور در اصل عقل اشیاء کے باہمی ربط کے متعلق صحیح فہم کے سوا کچھ نہیں۔

مذہب اور فلسفہ: مذہب میں فلسفہ کا خلاصہ دجوہر تو موجود ہوتا ہے لیکن اس کو وہ مختلف طریقہ سے ادا کرتا ہے اور اُس کے تصورات کو زیادہ محسوس شکل میں پیش کرتا ہے۔ بغیر مابعد الطبیعیاتی خلا میں اپنے آپ کو گم کر دینے کے مذہب کائنات کے برترین تصور تک پہونچ سکتا ہے۔ خدا کا مابعد الطبیعیاتی تصور صفات کی نفی سے حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ وجودِ مطلق کو غیر موصوف ہونا چاہئے (تعطیل)، چنانچہ ایک مشہور مصنف کہتا ہے کہ "جب تم خدا کے متعلق فکر کرنے لگو تو تمھیں چاہئے کہ اس کو مکان وزماں میں مقیّد نہ کر دو۔ تمھیں چاہئے کہ زماں، مکاں، مادہ بلکہ فکر تک کے تعیّنات و تقیّدات سے اس کو منزّہ سمجھو۔" "اس کے متعلق اس طرح فکر کرنا درحقیقت اس کے متعلق فکر سے کام نہ لینا ہے، مختصر یہ کہ یہ وجودِ تحت عدمِ محض قرار پاتا ہے[۱]"

اس طرح ہمیں اس وجود کا تصور حاصل ہوتا ہے جس کو قدیم یونانی فلسفیوں نے احد، ہستی وغیرہ کے ناموں سے پکارا ہے:

ذہنِ انسانی خدا کو اپنی صورت پر قیاس کئے بغیر بھی ایک ایسے خدا کی ضرورت محسوس کرتا ہے جس کے آگے وہ سرِ عبودیت خم کر سکے، جو اپنی صفات[۲] کی حد تک کسی نہ کسی طرح قابلِ فہم ہو، اس کی احتیاجات کو رفع کرنے کی قوت رکھتا ہو اور ان صفات کا حامل ہو جس کو انسانی ذہن بہترین قرار دیتا ہے۔ ایسے خدا کا جو ہمہ تواں وہمہ داں ہے، جو حکیمِ مطلق ہے اور جو رحیم و عادل ہے، اسلام اعلان کرتا ہے۔ باوجود اپنی سرمدیت و نامتناہیت، حضورِ مطلق، وحدت و مطلقیت کے وہ ذہنِ انسانی کے لئے عدمِ محض نہیں بلکہ حی و قیوم ہے جو کائنات اور قلبِ انسانی پر اپنی رحمانیت

---

[۱] دیکھو Walter Pater: Plato and Platonism.

[۲] خدا کی ذات کا علم انسان کو نہیں ہو سکتا: کلّ الناس فی ذات اللہ حمقاً (ای فی معرفۃ ذات اللہ) ؎

عنقا شکارِ کس نشود دام باز چیں کاینجا ہمیشہ باد بدست است دام را (م)

کے ساتھ حکمرانی کرتا ہے۔

اگر اس تصور میں تشبیہ کا اعتبار رہے تو پھر یہ انسان کے لئے ناگزیر ہے اور اس خدا کے لئے بھی جس کی انسان عبادت کرسکتا ہے۔ انسان کی احتیاجات کی تشفی کے لئے ذاتِ مطلق میں تشبیہ کا یہ اعتبار لازمی ہے، اور مذہب کے نہ کوئی معنی باقی رہتے ہیں اور نہ اس کا کوئی مقصد اگر وہ عبد و حق کے درمیان قُرب و معیت کا رشتہ نہ قائم نہ کرے۔ اس رشتہ کا قائم کرنا مذہب کا کام ہے اور دنیا کے مختلف مذاہب نے ایسا کیا ہے خواہ اچھی طرح ہو یا بُری طرح۔

جنت اور دوزخ: ہمیں یہ ہرگز فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ قُرب و معیت کا یہ تصور قلبِ انسانی کیلئے نہایت عزیز ہے اور اس کے بغیر مذہب کا بھی وجود ممکن نہیں۔ ان امور کو پیش نظر رکھنے سے چند نتائج لازم آتے ہیں جن کا خیال ہمیں اس وقت بھی رکھنا پڑتا ہے جب ہم کسی مذہب سے عام طور پر یا خصوصیت کے ساتھ بحث کررہے ہوں۔ ذہنِ انسانی کی تشفی کے لئے زندہ خدا کی اخلاقی صفات صداقت، خیر، عدل و رحم ہونی چاہئیں۔ ان سے براہِ راست نتیجہ کے طور پر سزا و جزا، دوزخ و جنت کا تصور لازم آتا ہے۔ جب تک کہ انسان خدا اور اس کی حول و قوت کے عقیدہ سے برگشتہ ہو کر کھُلا زندیق یا ملحد نہیں ہوجاتا وہ اپنے ذہن سے اس تصور کو دور نہیں کرسکتا۔ اب اگر سزا و جزا ضروری ہیں تو پھر ایک دن اعمال کے حساب کا ہوگا، اس کے لئے کوئی مقام ہوگا اور لذت والم کی وہ کیفیت بھی ہوگی جو محسوسین پر بطور نتیجہ طاری ہوگی۔ اور یہ کیفیت ایسی ہونی چاہیئے جو انسانی ذہن کے لئے قابل تصور ہو، یہ محض فلسفیانہ نفی نہ ہونی چاہیئے۔ یہ کہنا (جیسا کہ بعض نظریہ پرست فلسفی کہتے ہیں) کہ شر خود دوزخ ہے اور خیر خود جنت، انسانی ذہن کو چکر میں ڈالتا ہے۔ مذہب ایسی زبان اختیار نہیں کرسکتا، اُس کو انسان کے دماغ اور قلب کے لئے کوئی محسوس و متعین شے پیش کرنی پڑتی ہے۔ دوزخ و جنت کے متعلق جو تشبیہات و استعارات سامی مذاہب نے

پیش کئے ہیں اپنی حیثیت کی وجہ سے فلسفیوں کی تحقیر کا نشانہ بنتے رہے ہیں، لیکن فلسفیوں کو یہ بات نہ بھولنی چاہئے کہ عوام[1] کے ذہن حواس ہی کے ذریعہ متاثر ہو سکتے ہیں۔ اگر کسی سے کہا جائے کہ جنت کے معنی روحانی مسرت کی ایک خاص کیفیت کے ہیں تو اُس کے ذہن میں کیا بات آئے گی، خواہ یہ ذہن کیسا ہی فلسفیانہ کیوں نہ ہو؟ کیا "روحانی مسرت" کے معنی فقدانِ اَلَم کے ہیں اور اَلَم کے معنی فقدانِ مسرت کے؟ فلسفیانہ ذہن کے لئے یہ کیسا خوشگوار دَور ہے! اس قسم کا سلبی الم فلسفی کو تو خوف زدہ کر سکتا ہے لیکن ایک معمولی آدمی کے ذہن پر کوئی اثر نہیں کر سکتا۔ لہذا الم کو تخیل کے سامنے ایک ناقابل برداشت عذاب بنا کر پیش کیا جانا چاہئے اور اس مقصد کے لئے دوزخ سے زیادہ کون سی شے موثر ہو سکتی ہے جو ایک دہکتی ہوئی آگ ہے؟ جنت کا نظارہ (جو روحانی مسرت کو ظاہر کرتا ہے) اس قابل ہے کہ اس پر زیادہ تفصیلی جمالیاتی بحث کی جا سکے اور ایک صنّاع کا تخیل اُسکو حُسن کی نہ صرف تمام صورتوں سے مزین کریگا بلکہ ان تمام کیفیات سے بھی جو حواس کو متاثر کرتی ہیں۔ اور انسان کا ذہن جمالیاتی واقع ہوا ہے، بالفعل نہ سہی بالقوی تو ضرور، لیکن مذہب غیر ضروری تفصیلات میں نہیں جاتا۔ وہ ایک سادہ لیکن موثر تصویر کھینچتا ہے جو حسن و لطافت و امن کو تعبیر کرتی ہے۔ جنت کی تشبیہ ایک باغ سے دی گئی ہے جس میں نہریں بہہ رہی ہیں۔ اصحابِ جنت کے لئے وہاں جائے نشست ہے (سُرُرٌ موضونہ) اور خوبصورت صاف و شفاف "کاسے" جن میں شرابِ طہور بھری ہے۔ وہاں حسین صورتیں بھی ہیں جو حُسن و جمال کا مجسمہ ہیں اور متقیوں کی لطفِ صحبت کا باعث۔ حُسن کے اس حِسّی ذکر کے ساتھ یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ جنت میں مقربین کو حق سبحانٗہ تعالیٰ کے حسن و کمالِ مطلق کی دید بھی نصیبِ جان ہو گی۔ مختصر یہ کہ روحِ انسانی کو اس عالمِ حقیقی میں اس

---

[1] خواص کے بھی، خواہ وہ کتنا ہی حواس دافع ہونے کا دعویٰ کریں۔ کانٹ کے فلسفہ کا مبتدی بھی جانتا ہے کہ علم بغیر احساسات کے ناممکن ہے (م)

حقیقت کی بھی براہ راست یافت ہو گی جس کو وہ التباس کی اس دنیا میں تخیل کی مدد سے پانے کی کوشش کرتا تھا۔ اس طرح گویا احساس کا ایک تسلسل ہو گا یعنی پہلے کے تخیل اور موجودہ ادراک میں تطابق ہو گا۔ کیا یہ وہ عالم نہیں جس کے ماورا، افلاطون کے تخیل کی اعلیٰ ترین کوششیں بھی بمشکل جا سکتی ہیں۔ کیا روحِ انسانی کے لئے کسی اور قسم کی جنت کا تصور کیا جا سکتا ہے جہاں نہ صرف اس کو بقا و خلود نصیب ہوتا ہے بلکہ اس کے وہ ملکات بھی محفوظ رہتے ہیں جن کی وجہ سے وہ شاعر الذات روح کہلاتی ہے۔

انسانی ذہن یا روح کی پہلی جبلی حرکت ایک شخصی خدا کی طرف ہوتی ہے نہ کہ کسی تجریدی خدا کی طرف؛ بعد میں جب وہ غور و فکر سے کام لیتا ہے اور جدلیاتی عمل کا استعمال کرتا ہے تو وہ ایک تجریدِ محض کو پاتا ہے جیسے پارمیناڈیس[۵۱] نے اپنے 'احد مطلق' کو پایا۔

اگر روح کے اپنے مبدء کی طرف رجوع کرنے کے یہ معنی ہیں کہ وہ روحِ کلی میں مستغرق ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کی عینیت و انفرادیت فنا ہو جاتی ہے تو اس کی مثال ایک قطرہ کی سی ہو گی جو سمندر سے جا ملتا ہے، اور پھر بقا یا خلود کے کوئی معنی نہ ہوں گے۔ لیکن اگر اپنی اصل و ماخذ کی طرف لوٹتے وقت وہ اپنی ان خصوصیات کو ساتھ لے جاتی ہے جو اس کی عینیت کو باقی رکھتی ہیں تو پھر بقا ایک حقیقت ہو گی اور خلودِ نفس کا ایک ایسی حالت میں استمرار و قیام جہاں اُس کو جسمانی قید و بند سے نجات حاصل ہے۔ اس طرح 'مذہب کہتا ہے'، روحِ انسانی خدا کی طرف پلٹتی ہے۔ مذہبی عقیدہ کے مختلف حصوں میں کوئی تضاد نہیں مثلاً ان حصوں کو جن میں بقائے روح کا ذکر ہے اور وہ جن میں حکم ایزدی کا بیان۔ یہ عقائد کے ایک ہی سلسلہ کی توافق پذیر کڑیاں ہیں۔ علاوہ ازیں یہ وہ کڑیاں ہیں جن پر عقلاً بحث کی جا سکتی ہے اور جنھیں فہمِ عام قبول کر سکتی ہے۔ یہ ہے اصل دعویٰ قرآن کا

۵۱۔ Parmenides. ایلیاٹہ مسلک کا بانی ۵۱۵ ق م کا یونانی فلسفی ہے (م)

جو انسان کو سمجھنے اور ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے۔ جس چیز کو فلسفہ نے صدیوں عقل سے ثابت کرنے کی کوشش کی تھی قرآن اس کو ایک واقعہ کے طور پر پیش کرتا ہے۔

جس چیز کو ہم قرابت یا رشتہ داری کہتے ہیں اس میں فطرت کا ایک زبردست قانون عمل کر رہا ہے اور روح میں بھی ایک ایسا ملکہ ہونا چاہیئے جس کے ذریعہ یہ عمل کرے۔ اگر ہم اس کو صحیح مان لیں تو پھر ہمیں اس امر پر بھی یقین کرنا ہوگا کہ جب روح اپنے ان ملکات وصفات کے ساتھ باقی رہتی ہے جو اس کی انفرادیت کا تعین کرتے ہیں تو اتحاد و قرابت و رشتہ داری کا یہ احساس بھی حیاتِ آئندہ میں اس کے ساتھ باقی رہے گا گو اس کی دنیوی کثیف خصوصیات نہ ہوں گی۔

اسی طرح فکر کرتے ہوئے اگر ہم ایک قدم اور آگے بڑھیں تو اس تصور (یا یقین) کے قریب جا پہونچیں گے کہ اس مستقل احساس کا تحقق جنت میں روحِ انسانی کی مسرت کے لئے اتنا ہی ضروری ہوگا جتنا کہ اس دنیا میں وہ تھا۔ دوسرا قدم ہمیں یہ یقین دلاتا ہے کہ جنت (جو کامل مسرت کا مقام ہوگا) میں اس تحقق کا پورا موقع ہونا چاہیئے۔ اس طرح ہمیں یہ یقین حاصل ہوتا ہے کہ روح کی ان ارواح سے ملاقات ہوگی جن سے وہ اس دنیا میں محبت کرتی تھی، یعنی باپ، ماں، بھائی، بہن، بچے، دوست واحباب سے۔ اور زن و شوہر سے ملاقات کیوں نہ ہو؟ اپنی کثیف اشتہاآت سے چھوٹ کر کیوں نہ روح اس معاملہ میں بھی ایک لطیف صورت میں اتصال اور ملاپ کی لذت سے فیض یاب ہو؟ میرا یقین ہے کہ تمام مذاہب اس کی اجازت دیتے ہیں اور قرآن تو اس چیز کو واضح طور پر بیان کرتا ہے سورہ ۳، رکوع ۲، آیتہ ۱۳ میں انسان کی دنیوی خواہشات (عورتیں، اولاد، سونا، چاندی وغیرہ) کا ذکر کرنے کے بعد آیت ۱۴ میں وہ جنت کی ”ازواجِ مطہرہ“ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ ازواجِ مطہرہ شہوانی خواہش کے معروضات سے بالکل مختلف ہیں۔ ”مطہرہ“ کے لفظ پر اتنا زور کیوں دیا گیا ہے؟ اسلام کی جنت کے سلسلہ میں اس آیت کو، جس کے معنی مذکورہ بالا آیت کی روشنی میں صاف نظر آتے ہیں

ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہئے، کیونکہ اسلامی جنت پر جاہل کینہ توز متعصب مصنفین نے شدت کے ساتھ حملے کئے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے قرآن کی آیات کی تفسیر میں اپنے خیالاتِ باطلہ کا انضمام کیا ہے۔

اب یہ ازواج مطہرہ، یا تو وہی دنیوی بیویاں ہوسکتی ہیں جو اپنے وجود میں روحانی اور مطہر ہوگئی ہیں یا دوسری ازواجِ مطہرہ جن سے مناسبت پائی جاتی ہے۔ اس سے حوروں، کی طرف خیال جاتا ہے جن کا بعض آیات میں ذکر آیا ہے۔ یہ ہستیاں خواہ کچھ ہوں، محض بازاری قسم کی عورتیں ہوں یا حُسن کے نقوشِ اولین جو افلاطون کے شاعرانہ فلسفہ میں ملتے ہیں، یہ جنت میں ہوس رانی کے لئے نہ ہوں گی۔ کیونکہ اس پاکی اور طہارت کا خیال کرتے ہوئے جو اس زندگی اور آیندہ زندگی کی ضروری شرط قرار دی گئی ہے ایسا گمان کرنا سخت بیہودہ پن ہوگا۔

حور، ایک لطیف تصور ہے۔ فرشتہ سے بھی زیادہ لطیف! نہ توصیفی اسلوبِ بیان کی کوئی باریک تجربہ نگاہوں کے سامنے اس شے کو پیش کرسکتی ہے جس کی ضرورت ہے اور نہ کوئی حسی تذکرہ اس قابل ہے کہ زندہ روحانی عالم میں جہاں تخیل حس ہے احسن کو اس سے کم حسی صورت میں بیان کرسکے۔ حور نہ تو عورت ہے اور نہ فرشتہ لیکن ان دونوں سے زیادہ خوبصورت ہے۔ اور اس کا کام محبتِ حُسن کی تشفی معلوم ہوتا ہے جو روحِ انسانی کی ایک ممتاز خصوصیت ہے اور وہی ہے۔ وہ ایک ایسی صورت کی نمایندگی کرتی ہے جو اس زندگی میں تو ہمارے حیطۂ خیال سے باہر ہے، جس کی یونانی صناع کے ذہن نے کبھی کبھی ایک جھلک دیکھی تھی اور جس کو اس نے اپنے فن کے ذریعہ حُسنِ مثالی کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہم سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ اس غیر معمولی توجیہہ کے لئے ہمارے ہاں کوئی معقول وجہ بھی ہے؟ لیکن ہم بھی یہ پوچھ سکتے ہیں کہ کیا حور کو ایک خیالی ہیوا قرار دینے کی بھی کوئی معقول وجہ ہے؟ اگر کوئی شخص ثانی الذکر توجیہہ کی تائید کرنی ممکن سمجھتا ہے تو پھر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ

ابھی اس کا قلب اس قابل نہیں ہوا ہے کہ شہوانی خواہشات کی دلفریبی کا مقابلہ کر سکے۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ حوروں کے متعلق ہمارا یہ تصور رائے کی غلطی ہے تو میں نہایت ادب کے ساتھ معروضہ کروں گا کہ فلاطون کے ساتھ مل کر غلطی کا ارتکاب کرنا جنت سے زیادہ قریب ہوتا ہے اور اس کی بہ نسبت زیادہ بہتر ہے کہ بعض مصنفین کی شہوت زدہ ذہنیت کا اتباع کیا جائے[1]۔

---

[1] مصنف نے حور کی جو توجیہہ کی ہے مترجم اس سے لفظاً لفظاً متفق نہیں اس کا تو وہی عقیدہ ہے جو سلف کے جمہور مفسرین کا ہے جو مشہور ہے۔ (م)

باب پنجم

رابطۂ وحدتِ خلق

"جس طرح بعینہ ایک ہی ہمہ گیر فطرت دنیا کے تمام حصص کو باہم ملاتی اور انکی توثیق کرتی ہے، اسی طرح اس نے تمام بنی نوع انسان کو ایک متفق و متحد خاندان کی وحدت میں مربوط کیا تھا لیکن انسان نے اپنی سیاہ کاری کی وجہ سے آپس میں جھگڑا اور فساد شروع کیا اور یہ نہ سوچا کہ وہ سب ایک ہی خاندان کے ارکان ہیں اور باہمی رشتہ رکھتے ہیں اور ایک ہی پروردگار کے سایۂ عاطفت میں پرورش پا رہے ہیں۔ اگر اس بات کا خیال رکھا جاتا تو تمام انسان دیوتاؤں کی سی زندگی بسر کرتے۔"

یہ ہیں وہ الفاظ جو سسرو، نے کچھ صدیوں پہلے لکھے تھے اور قرآن کریم نے اسی واقعہ کا تیرہ سو برس پہلے سادہ الفاظ میں اعلان کیا تھا، لیکن اتنا زمانہ گزر جانے کے بعد بھی ہم صرف تمنا ہی کر رہے ہیں کہ کاش تمام بنی نوع انسان ایک نسل اور ایک متحدہ قوم ہوتی!

مرض: کیا اب بھی ہمارا یہ خواب نہیں اور کیا ہم اس کے متعلق اس طرح گفتگو نہیں کر رہے ہیں کہ گویا ہم سنجیدہ ہیں اور اس خواب کو صحیح کر دکھانا چاہتے ہیں؟ کیا کوئی مجلسِ اقوام اس مقصد کے حصول میں کامیاب ہوگی؟ ہماری امن و صلح کی ساری انجمنوں اور تخفیفِ اسلحہ کے سارے پیشکشوں کا حقیقی مفہوم

کیا ہے؟ ممکن ہے کہ ہماری کوششیں مخلصانہ ہوں، لیکن بدقسمتی سے یہ صرف خارجی شرائط ہی کی حد تک محدود نظر آتی ہیں اور ان کی پہونچ ان اہم شرائط تک نہیں ہوتی جو انسانی معاملات کے قلب میں پائی جاتی ہیں، اور یقیناً خلوص کے ساتھ وہ یہ نہیں چاہتیں کہ نزاع واختلاف کے اندرونی اسباب کو رفع کیا جائے۔ ہمارے قلوب پر اب بھی اُن ہی قدیم اور پختہ تعصبات کا رنگ چڑھا ہوا ہے جن کا تعلق مذہب، قومیت، ملک اور تجارتی اغراض سے بڑا ہے اور ہم اپنے تمام احتجاجات کے باوجود ان موانع کو رفع کرنے کی یا تو قوت نہیں رکھتے یا ان کو رفع کرنا نہیں چاہتے جو ہمیں انسانیت کی اساس مشترک پر جمع ہونے سے روک رہے ہیں۔ اب بھی ہم جغرافی حدود کی پابندی کرتے ہیں جنھیں ہم نے بڑی قومی اہمیت دے رکھی ہے اور اپنے نفوس کو زبردستی یہ باور کرا دیا ہے کہ یہ بعض ذہنی اور اخلاقی نمونوں کے مطابق ہیں جن سے برتری وکمتری کی صفات کی تعبیر ہوتی ہے کیا اس قول کے متعلق کہ "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب"، یہ نہیں سمجھا جاتا کہ اس میں بین الاقوامی حکمت و دانائی اور سیاسی مصلحت اندیشی کا خلاصہ پایا جاتا ہے؟

جغرافی حدود کے تقدس کو تسلیم کرنے میں کیا ہم تاریخ کے ایک اہم سبق کو فراموش نہیں کر رہے ہیں جو ان حدود کو برابر الٹتا جا رہا ہے؟ فاتحینِ عالم نے نیا جغرافیہ بنانے میں بڑی خوشی محسوس کی، اور تاریخ ان کے فتوحات کے پیچھے پیچھے چلتی رہی اور مستعدی کے ساتھ ان کے معرکوں کو قلم بند کیا اور زمین کا نقشہ بدل دیا۔ جب یورپ نے عقابانِ روم کی سرکردگی میں اپنے جغرافی حدود سے تجاوز کیا اور افریقہ، مصر، عراق، فلسطین اور یمن کو اپنا باج گزار علاقہ اور سلطنتِ روما کا ایک جزو قرار دیا، اور جب ایشیا نے دینِ اسلام اور عربی قوت کی رہبری میں بے حس سلطنتِ روما کے تقریباً ان ہی تمام حصوں کو زیرِ نگیں کر دیا، تو پھر جغرافی حدود کہاں رہے؟ اور اب زمانۂ جدید کی سب سے بڑی حکومت کے زیرِ تسلط ان کا کیا حشر ہوا ہے؟ یہ محض معاہدات تھے اور انھیں معاہدات

ہی سمجھا گیا اور دوسرے معاہدات نے ان کی جگہ لے لی۔ لیکن یہ عظیم الشان اور قابلِ آرزو معاہدہ کہ تمام بنی نوع انسان کو ایک قوم قرار دیا جانا چاہئے ابھی تک جیسا کہ چاہئے تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔

دنیا کے اس تھوڑے سے ہی عرصہ میں جس کا تاریخ علم رکھتی ہے جغرافی حدود کچھ ایسے گڈمڈ، اور نسلیں، رواجات، آداب و رسوم حتیٰ کہ عقائد و ایمانیات بھی ایسے مخلوط و ممزوج ہوتے رہے ہیں کہ یہ واقعہ کہ انسانیت اب بھی مختلف رواجی حصوں میں منقسم ہے، تعجب انگیز معلوم ہوتا ہے لیکن آنکھیں اس ناقابلِ تردید واقعہ کی موجودگی کا انکار نہیں کرسکتیں۔ جس قدر ہم اس کو نظر انداز کرنے کی خواہش کرتے ہیں اسی قدر اس کا ظلم و ستم ہمارے مخفی احساسات پر زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ کیا اہلِ یورپ اب بھی اہلِ ایشیا کو دور کے تعلق سے اور بطور مجاز اپنا بھائی نہیں سمجھتے، اگرچہ کہ بھائی کے بھورے یا زرد چمڑے، اس کے مختلف مذہب، اور اس کے غیر مہذب طریقوں اور تنفر انگیز جذبات کا خیال جب ان کے دل میں پیدا ہوتا ہے تو پھر اس کو برادرانہ ہمدردی و مواساۃ کے قابل نہیں رکھتا؟ اہلِ یورپ کا فطری تعصب جو ان کو مذہب، تہذیب، اخلاق اور انسانی قابلیت کے متعلق بعض موروثی یا روایتی تصورات کا سخت پابند بنا دیتا ہے ان معاملات میں اس اختلاف کو اور زیادہ نمایاں کرنے کا میلان رکھتا ہے جو ان میں اور دوسروں میں پایا جاتا ہے۔ اگر لطیف تر احساس سے کام لیا جاتا اور ان امور کے اتفاقی ہونے کا خیال رکھا جاتا تو یہ اختلاف بڑی حد تک دور ہوجاتا۔ اسی طرح ایشیا کا باشندہ بھی اپنے تعصبات اور اوہام رکھتا ہے اور چونکہ وہ مسلمہ طور پر زیادہ پست مرتبہ واقع ہوا لہٰذا وہ اپنی خام ذہنیت اور اس سے پیدا ہونے والی بصیرت و مواساۃ کی کمی و کوتاہی کو نہیں ترک کرسکتا۔ اسلام نہایت جرأت کے ساتھ ان امتیازات و اختلافات کو مٹا کر چھوڑتا ہے۔

علاج: (۱) توحید، مرکز، اجتماع: ہمیں مرض کے موجودہ علائم نظر آرہے ہیں؛ اور اسلام ان کا علاج تجویز کرتا ہے: ایک بدلا ہوا نقطۂ نگاہ جس میں قدیم توہمات اور تعصبات کا کوئی شائبہ نہ ہو! اس کے حصول کا پہلا

قدم ہمارے مذہبی عقائد کی تطہیر وتسہیل ہونی چاہئے۔ مرکزی عقیدہ تو یقیناً خدا کی وحدانیت ہوگا، جو تمام خلق کا مبدء ہے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جس کی عقل اور فلسفہ سے تائید اور تقویت ہوتی ہے اور جو درحقیقت تمام مذاہب میں موجود ہے۔ لہٰذا اس کو اساسِ مشترک قرار دینے میں تعلیم یافتہ لوگوں کی راہ میں کوئی مشکل نہیں واقع ہونی چاہئے۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ تمام توہمات وتعصبات ترک کردیئے جانے چاہئیں جن کی پرورش اسرار وغموض سے ہوتی ہے اور جو خود مذہبی پیشواؤں کی دسیسہ کاریوں اور اذعانی دینیات کی پیداوار ہیں!

علاج: ۲) بانیانِ مذہب کا احترام: کثرتِ آلہہ کا عقیدہ (یا شرک) جیسا کہ ہم جانتے ہیں، اس توجیہہ کے پیچھے پناہ لیتا ہے کہ اللہ ایک ہے لیکن دوسرے مسلّمہ الٰہ اللہ ہی کی مختلف صفات وقُویٰ کے محض مظاہر ہیں۔ اس نظریہ کے قائل کو سمجھایا جا سکتا ہے کہ خدائے واحد و برتر کا مجرّد وتصوّر بہ نسبت محکوم و ماتحت آلہہ کی کثرت کے زیادہ پاک، لطیف اور بلند ہے، خواہ یہ آلہہ محض ظہور یا بروز قرار دیئے جائیں یا علیٰحدہ ومستقل موجودات۔ یہاں تک تو کوئی ایسی مشکل نہیں جو دور نہ کی جاسکتی ہو، لیکن جب ان اکابر کی رسالت کا سوال پیدا ہوتا ہے جو مختلف مذاہب کے حامل ہیں تو پھر قدیم ائتلافات کی قوت اور ان سے پیدا ہونے والے تعصبات کی شدت ممکن ہے کہ بعض اہم موانع پیش کرے۔ لیکن اُمید ہے کہ رواداری کا وہ جذبہ جس کو صحیح تعلیم نے پیدا کیا اور تقویت دی، اور جس کی تائید ان حضراتِ کرام کے اعلیٰ مقام واحسانات کے احترام سے ہوتی ہے جنھوں نے بنی نوع انسان کی ایمان وعمل صالح کی طرف ہدایت کی۔ ان موانع کے دور کرنے میں قلب کی مدد کریگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا صدہا سال سے پیمبروں اور عارفوں کی تعلیم سے مستفید ہوتی رہی ہے اور ان میں سے ہر ایک نے انسان کی ہدایت واصلاح میں بڑا حصّہ لیا ہے۔ لہٰذا روشن دماغ افراد کے لئے کوئی مشکل نہ ہونی چاہئے کہ وہ ان کی یاد کا احترام کریں۔ یہودیت ونصرانیت واسلام پیرووں کے لئے تو راستہ تیار ہے، انھیں صرف اپنے نقطۂ نگاہ کو ذرا وسیع کرنا ہے اور اپنے گزشتہ جھگڑوں کو

بھلا دینا ہو۔ وہ اسی ایک خدا پر ایمان لاتے ہیں اور اس کی عبادت کرتے ہیں، اور اسی کرۂ زمین پر ان ہی پیغمبروں کے ذریعہ جن کا ایک ہی نسل سے تعلق تھا نورِ ہدایت حاصل کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر پیغمبر نے اپنے پیشرؤوں کی رسالت کا اقرار کیا اور اُن کو خدا کا منتخب رسول ان کر ان کی عزّت کی۔ کیا ہمارے اتحاد واتفاق کے لئے یہ اساسِ مشترک کافی نہیں؟ اور اگر ہم ان تعصبات کو بھی دور کرسکیں جو ایمانِ خالص کے گرد جمع ہوگئے ہیں۔ اور ان رسوم کو ترک کردیں جو محض نمائش اور ظاہر پسندی پر مبنی ہیں تو ہمارے لئے راستہ اور زیادہ آسان ہوجائیگا۔ مذہب، تہذیب یافتہ افراد کی نگاہوں میں۔ اخلاق ہی جس کو ایمان نے جلیل القدر بنادیاہو؛ اس نظریہ کے متعلق سبھوں کا اتفاق ہوسکتا ہے۔ اور یہی اسلام کی تعلیم ہے۔

جہاں تک میں قرآن کی ان عبارتوں کو سمجھ سکا ہوں جن میں کفرِ جحود کے لئے عذاب کی وعید دی گئی ہو، میرا خیال ہو کہ خدا کی وحدانیت اور اس کے انبیاء کی رسالت ہی کے انکار پر لعنت بھیجی گئی ہو۔ یہ بالکل منطقی چیز ہے۔ کیونکہ جو شخص ایک خدائے برتر پر ایمان نہیں لاتا وہ اس کے عدل وکرم پر بھی یقین نہیں رکھتا اور اس لئے اپنے کو جان بوجھ کر ان صفات کے فائدے سے محروم کردیتا ہے۔ کیا وہ اپنے کو تناقض میں مبتلا کئے بغیر ایک ایسے حلقہ میں جس کے تحتِ حکومت وہ نہیں کسی حق کا دعویدار ہوسکتا ہے؟

بیسویں صدی میں جبکہ معمولی سا معمولی تہذیب یافتہ انسان بھی بُت پرستی کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور صرف ایک ہی خدا کے وجود کو ممکن سمجھتا ہے، ظاہر ہے کہ اس کا ایمان، خواہ وہ کچھ ہو، فطری طور پر خدائے واحد و لاشریک ہی پر ہوگا۔ اس طرح موجودہ زمانہ میں کفر یا انکار کا زیادہ اہم پہلو تو ناممکن ہوگیا ہو۔ رہا انبیاء کی رسالت پر ایمان، تو جو شخص ان کی تعلیم کے معجز نما نتائج سے واقف ہو جو اہلِ فسق و فجور کی ہدایت واصلاح کے سلسلہ میں رونما ہوئے ہیں، وہ ان کی رسالت کا کسی طرح انکار نہیں کرسکتا۔ دنیا میں ان کا پیام سب زیادہ کامیاب رہا ہے، جو لوگ کسی تحریک پر اسی وقت یقین کرتے ہیں جب وہ کامیاب ثابت ہو، یہ ان کے لئے ایک قوی حجت ہو۔ اور جو خلوص کو انسان کی صداقت کا واحد معیار قرار

دیتے ہیں ان کے لئے انبیاء کے اس جذبہ کے سوا کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں جو ان کے کام میں نمایاں ہے ان کا یہی الہٰی جذبہ تھا جو ان کے پیام کی صداقت کا اعلان کرتا تھا۔ ان ہی خالص عقلی دلائل کی بنا پر مجھے یقین ہے کہ ان تمام روحانی رہنماؤں کی عظمت و تقدس کا ماننا، جو دنیا میں وقت بوقت مبعوث ہوتے رہے، اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ خدائے واحد کی برتری کا قبول کرنا۔ قرآن کا یہ مرکزی عقیدہ ہے اور بنی نوع انسان کو اسی کی دعوت دینے کے لئے عربوں نے دنیا میں قدم اُٹھایا۔

"اسلام جنگجو دین نہیں" مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ جدید یورپ کا صداقت پسند قلب بالآخر اس چیز کی طرف ایک زبردست کشش محسوس کریگا جس کو اس نے اب تک غلط سمجھا اور بدنام کیا۔ وہ یہ اچھی طرح جان لیگا کہ اسلام کوئی "جنگجو دین" نہیں، گو مدافعتِ ذات کیلئے اسکو جنگ کرنی پڑی ہو۔ گبن تاریخ کے پُر شکوہ منظر کی دلفریبی و دلکشی سے متاثر ہوکر یہ جملہ استعمال کرتا ہے کہ عرب "ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں قرآن" لیکر بڑھے! سلطنتِ روما کے زوال کے اسباب کا مؤرخ ہونے کی حیثیت سے اس کو اس واقعہ کی توجیہہ کرنی تھی جو ساتویں صدی مسیحی میں سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز واقعہ تھا یعنی مشرقی رومی سلطنت کی سرحد پر اسلامی قوت کا نہوض۔ دشتِ عرب کے برہنہ بدوی کا مسلح رومی سپاہی کے مقابلہ میں آنا واقعی ایک عجیب و غریب چیز تھی۔ قرآن (جو اس کو ابھی دیا گیا تھا) نہ صرف اس کے ہاتھ میں تھا بلکہ اسکے دل میں بھی تھا اور تلوار تو ہمیشہ اس کی رفیق رہی ہے۔ زندگی میں ان ہی دو تحفوں کو لئے ہوئے سفر کرنا اور اپنی صوابدید پر ان کا استعمال کرنا اس کے لئے بالکل فطری چیز تھی۔ اتفاق سے اس کو عظیم الشان قوتوں سے مقابلہ کرنا پڑا جو قدیم تہذیبوں کی نمایندگی کررہی تھیں، اس کی جبلی فراست نے ان کے نمائشی پردوں کو چاک کرکے ان کے اندرونی انحطاط کو پالیا اور ساتھ ساتھ اپنی بڑھتی ہوئی قوت کا بھی احساس کرلیا۔ اس نے انھیں صرف اپنی تلوار کی نوک سے چھوا اور وہ پاش پاش ہوکر رہ گئے! لیکن اس نے تلوار کے زور سے انھیں ہرگز مجبور نہیں کیا کہ وہ قرآن قبول کرلیں، اتنا ضرور کہا کہ اگر وہ اس کا دین قبول کریں تو وہ اس کے بھائی

کہلائیںگے۔ ساتھ ساتھ اس نے یہ بات بھی صاف کر دی کہ وہ لڑنا چاہیں تو یہ بھی اپنی حد تک بالکل تیار ہیں اور یہ بات بھی اتنی ہی واضح کر دی کہ اگر وہ لڑنا پسند نہ کریں بلکہ اس کے باجگزار بن جانا چاہیں تو انھیں ہر سال اس قدر باج ادا کرنا ہوگا اور پھر وہ اس کی حفاظت میں ہو جائیںگے۔ اس نے ان کے مذہب کو نہیں چھیڑا، اس سے اس کو کوئی سروکار نہ تھا۔ یہ تاریخ ہے، مخالفِ اسلام متعصب مصنفین اس کے خلاف خواہ کچھ کہیں! خود گبن نے عربوں کی انسانیت (بلکہ ان کے رفق و ملائمت) کی بیشمار مثالیں دی ہیں جن کا وہ دیگر اقوام کے ساتھ معاملہ کے وقت اظہار کرتے تھے، اور اس چیز نے اہلِ روما کو اس قدر متاثر کیا تھا کہ ان کے بعض اعلیٰ عہدہ دار، مثلاً رومانس، حاکم بصرہ، بطیب خاطر حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اوکلے اور گبن دونوں "قرآن اور تلوار" کے اتہام کے خلاف خود کافی اچھے گواہ ہیں۔

مجاہدین اسلام: تاریخ اسلام، جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے، بطل وشی اور جانبازی کے واقعات سے مالامال ہے، اور ایک ایسے متحدہ قومی عمل کا عجیب و غریب نظارہ پیش کرتی ہے جو اس جذبہ کے زیر اثر پیدا ہوا جو ایک ہمہ بیں و ہمہ تواں رحیم و کریم قوت پر غیر متزلزل ایمان رکھتا ہے۔ اسلام ایک ایسی تحریک کا باعث ہے جس نے مجاہدین پیدا کئے اور پھر اس تحریک کی ایسی رہنمائی کی کہ بہت جلد مجاہدین کی ایک پوری قوم تیار ہو گئی جس کی دوسری قوم یا ملک کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اسلام کی پہلی صدی میں ایک جدید قوت، جدید سلطنت اور جدید تہذیب کا آغاز ہوتا ہے عظیم الشان اہمیت رکھنے والے بیشمار ایسے واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں کہ جن کے مقابلہ میں ہزار ایلیڈ اور انیڈ کی بھی کوئی ہستی نہیں۔ اس موضوع کے لئے صرف ایک رزمیہ نظم کافی نہیں بلکہ ایسی بیشمار نظمیں درکار ہیں جن میں سے ہر ایک کا عنوان ایک عظیم الشان مملکت کی پیدائش ہو جو ایک عظیم المرتبت دین کی خارجی علامت ہوتی ہے۔ ایلیڈ میں شہر ٹرائے کی تباہی کا ذکر ہوتا ہے، یونان کی متعدد مملکتوں اور سلطنتوں کی متحدہ افواج نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، اور بظاہرہ صرف اکیلیس کی مغرورانہ شجاعت اور ہکٹر کی خود پسندانہ جاں بازی کا ہوتا ہے۔ لیکن اسلامی

ایک کی عظمت اور اس کے مجاہدین کے کارناموں کی شان وشوکت کا یہ حال ہو کہ ایران وعراق، مصر و افریقیہ واندلس کے فاتحین کی شخصی فتوحات کا ذکر صرف ایک جدید عالمگیر تحریک کی نیم فراموش کردہ تفصیلات کی حیثیت سے ہوتا ہو! واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ کے لوگوں نے بھی ان کے کارناموں کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھا کہ یہ ان سچے مسلمانوں کے فرائض کی انجام دہی ہے جن کے ہاتھ تو سلطنتوں کا تختہ اُلٹ سکتے ہیں لیکن جن کے قلب بے مثل ایثار اور قربانی کے قابل ہوتے ہیں۔ یہ تھا قرآنی تعلیم کا اثر!

اسلام بہادروں کا دین ہے: | میری رائے میں اسلام کی خصوصیات ایسی ہیں کہ وہ بہادروں کا مذہب معلوم ہوتا ہے: اس کی بے نفسی اور حطامِ دنیوی سے تنفر؛ اس کا پُرسکون تحمل جو ایک غیر مرئی لیکن حاضر وناظر خدا پر کامل توکل کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، جس کی عبادت کے لئے مرئی علائم کی حاجت نہیں؛ اس کی سنجیدہ اور محتاط رجائیت جو قنوط اور دل شکستگی کی اجازت نہیں دیتی؛ اس کا ایک عادل ومنصف قوت کی مشیت وارادہ کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا؛ حیاتِ کلّی کے ایک ایسے نظام پر اس کا غیر متزلزل ایقان جس کی بنیاد خیر پر قائم ہو! اسلام کا ایک سچا پیرو ہمیشہ خدا کی معیّت کا احساس رکھتا ہو (وھو معکم اینما کنتم) اور اس لئے کسی چیز سے نہیں ڈرتا اور "لاخوفٌ علیھم ولا ھم یحزنون" کا مصداق ہوتا ہے۔ کوئی چیز اس کو نقصان نہیں پہونچا سکتی کیونکہ اس کے خالق کی خوشنودی ورضامندی کے سوا کوئی چیز اس کے نزدیک قیمت ہی نہیں رکھتی۔ موت سے اس کو خوف نہیں کیونکہ وہ موت کو ایک برتر زندگی کا زینہ سمجھتا ہے جو قُربِ الٰہی کا باعث ہے۔ اس کو اس عقیدہ کی تعلیم دی گئی ہے کہ خیر خدا کی جانب سے ہے اور شر انسان کے نفس کی طرف سے: "الخیر کلّہ فی یدیک والشر لیس الیک" (حدیث) ما اصابك من حسنةٍ فمِنَ اللہ وما اصابك مِن سیّئةٍ فمن نفسك (الایۃ) اس کا یہ بھی ایمان ہو کہ بالآخر خیر کو شر پر اور حق کو باطل پر فتح ہوگی: "بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغہ فاذا ھو زاھق"، شر کا اس کے نزدیک کوئی جدا اور مستقل وجود نہیں، وہ خیر کے عدم یا فقدان کا نام ہو۔ اپنے جذبات کے

گمراہ کن اثرات کے تحت انسان ایسی اشیاء کے پیچھے پڑتا ہے جو اپنی ذات کے اعتبار سے دوام نہیں رکھتیں. جب عقل سے ہدایت پاتا ہے تو توبہ کرتا ہے اور اس کی روح گناہوں سے پاک و صاف ہو جاتی ہے مصیبت اس کے لئے ابتلاء ہے جو اس کو خدا کی طرف رجوع کرتی ہے، اور اگر دنیا کی مصیبتوں کا انجام موت ہے تو دنیا کی نعمتوں کا بھی یہی انجام ہے اور موت ایک دروازہ ہے جس سے گزر کر اس کو ایک اعلیٰ اور برتر زندگی کی طرف جانا پڑتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہو کہ اگر اس نے اپنی دنیوی زندگی ناجائز و مکروہ لذات میں گزاری ہے تو اس دروازہ سے گزرتے ہی اس کی تطہیر کا عمل شروع ہو جاتا ہے، اور اگر اس زندگی میں مصائب برداشت کرکے اس نے اپنی تطہیر کر لی ہے تو پھر راحت و سکون نصیبِ جان ہوتے ہیں۔ جنت میں اس کو کامل مسرت و سکون ہوگا اور مبدءِ حیاتِ سرمدی کا قرب حاصل ہوگا اور اس کی زندگی خدائے ذوالجلال کی دائمی تسبیح و تہلیل ہوگی!

یہ وہ فلسفۂ حیات ہے جس کی قرآن ہمیں تعلیم دیتا ہے! کیا تمام فلسفوں اور تمام مذہبوں کا بالآخر یہی یقین نہیں، گو اس کو یہاں کسی قدر مختلف زبان میں ادا کیا گیا ہے؟

لیکن قرآن یہیں پر بات ختم نہیں کر دیتا۔ فکر کو یقین کی صورت اختیار کرنی چاہئے اور یقین کو جذبہ کی قوت ملنی چاہئے جس کا اظہار عمل میں ہونا چاہئے۔ اسی فطری طریقہ سے قرآن اور اس کے حامیوں نے دنیا کے آگے تاریخِ اسلام کے شاندار تجربے کو پیش کیا!

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است این کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں مسلماناں اگر داری نظر در ضمیرِ خویش و در قراں نگر
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست عصرہا پیچیدۂ در آناتِ اوست
بندۂ مومن ز آیاتِ خدا ست ہر جہاں اندر برِ او چوں قبا ست
چوں کہن گردد جہانے در برش می دہد قراں جہانے دیگرش (اقبال)